دُنیا
آپ کی
شمیم افزا قمرؔ

دُنیا آپ کی

(افسانے)

ڈاکٹر شمیم افزا قمر

ادارہ فکرِ جدید

نئی دہلی ۲

انتساب

محترم نانا حضور عبد الصمد خاں صاحب مرحوم
(ریٹائرڈ ڈی۔پی۔آئی)

اور

محترم سید اختر اورینوی صاحب مرحوم
(صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی)

کے نام جو مستقل ایک درسگاہ رہے

فہرست

پیش لفظ

میں اکثر کہانیاں لکھتی رہی ہوں، اس لیے نہیں کہ کوئی شہرت حاصل کروں بلکہ اس لیے لکھتی رہی ہوں کہ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ لکھتی رہوں کچھ کہتی رہوں۔ کبھی یہ کہانیاں کسی ردِ عمل کے طور پر لکھی گئیں کبھی کسی واقعہ، حادثہ یا کردار سے متاثر ہو کر۔

مجھے دنیا اور اس کی کج روی کا احساس ہمیشہ ہی رہا ہے حادثات جس طرح انسان کی گھات میں رہتے ہیں یا انسان اپنے آپ کو کس حد تک پستیوں کی طرف لے جاتا ہے، اپنے کردار کو زخمی اور داغ دار بناتا ہے، بے حد تباہ حال رہنے کے باوجود اپنی پستیوں کا احساس نہیں کرتا لیکن پھر بھی وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اس وسیع دُنیا میں انسان کی حیثیت محض زمین پر رینگتے کیڑوں کے جیسی ہے پھر بھی وہ قدرت کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ "دل کا کیا رنگ کروں" ایسے ہی نقش فریادیوں کی کہانی ہے۔ اقبالؔ کا ایک شعر بار بار ذہن میں گونجتا ہے ؎

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

قصور انسان کا ہے یا خدا کا، وقت اور زمانے کا ہے یا انسان کا، اس کا

جواب تو مجھے نہیں ملتا لیکن یہ ایسا ضرور محسوس کرتی ہوں کہ اگر انسان دوسروں کی بد دعائیں نہ لے اور دُعائیں لے تو اس بدنصیب دنیا کی پستیوں کا کچھ نہ کچھ ازالہ ہو ہی جائے گا۔

شمیم افزا قمر

زمانہ بدل گیا

ملگجی سی صبح کی روشنی چھاؤنی کی عمارتوں پر آڑے ترچھے پڑ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی اور پھوار کی چھٹا سیں عمارتوں کے شیشہ جڑے دریچے پر بوند بوند جمع ہو کر بھی ایک لمبی قطار بنا دیتے جو کمرے کی دھندھ میں کچھ اور اضافہ ہی کر رہے تھے۔ کیپٹن نیازی کے گوتھک اسٹائیل کے بنگلہ میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف ایک مینا کبھی دریچہ کے چھجے پر بیٹھ جاتی کبھی پھدک کر برآمدے میں آ بیٹھتی۔ شانو کچن میں چائے تیار کر رہی تھی۔ اس نے اِس اکیلی پھدکتی ہوئی مینا کو دیکھا اور بیسیوں بار رٹا ہوا جملہ پھر سے دہرایا

"ONE FOR SORROW
TWO FOR JOY "

نجانے آج کا دن کیسا گذرے گا۔ کچن ٹیبل پر چائے کی پیالیاں جمائے ہوئے اس کا دل وہم سے بھر گیا۔ گیس کے چولہے پر چائے کی کیتلی چڑھی تھی۔ جس سے بھاپ نکل نکل کر پانی کے تیار ہو جانے کا اعلان کر رہی تھی۔ چائے دانی میں پتیاں ڈال کر اس نے جلدی سے چائے تیار کی اور پیالیوں میں ڈال کر کمرے تک پہنچی۔ کیپٹن نیازی کو چائے دے کر وہ بستر پر دراز رئیسہ کی طرف آئی۔

"امی چائے پی لیجئے۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

رئیسہ نے نیم خوابیدہ نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر شبنم سے دُھلے پھولوں کا نکھار تھا۔ گندمی رنگت گاہے گاہے بادلوں سے چھن کر آنے والی کرنوں میں

سنہری معلوم ہو رہی تھی۔ کٹورے جیسی کھلی آنکھوں میں معصومیت تھی اور اونچے کٹے گھنے بال چہرے پر بکھر رہے تھے۔ وہ بھورے رنگ کا ایک ڈھیلا ڈھالا اسکرٹ پہنے، پیروں میں فلائنگ سلیپر ڈالے چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی اس سپید تھی سپاٹ سی لڑکی نے شاید ابھی تک شباب کی دستک نہیں سنی تھی یا سن کر بھی انجان بن گئی تھی۔ وہ اپنے جاتے ہوئے بچپن کی سرحدوں سے چمٹ کر نرسری کی پوئیم گاتی جاتی یا پھر ONE FOR SORROW TWO FOR JOY کے توہم میں مبتلا ہو کر تمام وقت آنگن میں پھدکتی ہوئی مینا کو گھورا کرتی۔

"امی چائے پی لیجئے نا" اس نے رئیسہ کو دوبارہ بیدار کیا۔

"ارے یہ تم امی مجھے کہہ رہی تھیں؟ میں نے سمجھا ہی نہیں"

رئیسہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے کان اس لفظ سے واقف نہ تھے۔ وہ اپنا خوبصورت نائٹ گاؤن پیروں پر برابر کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"میں تو اب آپ کو امی ہی کہوں گی!"

"وہ کیوں بھلا؟" رئیسہ کے سر سے اوپر تنے ہوئے ہاتھ اچانک ڈھیلے پڑ کر نیچے آ رہے تھے اس کی کاجل بھری خوبصورت آنکھوں میں حیرت اور الجھن کے نقوش ابھر آئے۔ باریک نائٹ گاؤن سے اس کا توبہ شکن جسم چھن چھن کر باہر آ رہا تھا۔ کمرے پیچے لٹکتے ہوئے گھنے بال اس کے کاندھے اور پیٹھ پر ساون کے بادلوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ آنکھوں میں اب تک نیند کا خمار تھا۔ مگر کیپٹن نیازی اس حسن مجسم کی طرف پیٹھ کئے ایک ایزی چیئر پر نیم دراز سگریٹ اور چائے کی پیالیوں میں مگن تھے۔ وہ ہمیشہ الصباح ہی اٹھ جاتے اور اس وقت تک اخبار اور کتابیں پڑھتے اور سگریٹ پیتے رہتے جب تک کہ شانو انہیں چائے نہ دے جاتی۔ رئیسہ ہمیشہ دیر سے اٹھتی اور اس وقت تک سوتی رہتی جب تک شانو اسے آکر نہ جگاتی۔

"میں امی کیسے کہوں بھلا؟" "اور کیا ماں سے بھی کوئی پیارا لفظ موجود ہے؟" شانو نے سنجیدگی سے کہا۔

"اے ہے شانو، تو پھر کیا ہوا۔ تم مجھے ممی ہی کہا کرو نا۔"

"نہیں آپا اب تو میں تمہیں اماں کہوں گی یا جلے سے حلامی۔ میرے کلاس کی سبھی ساتھیاں اپنی امی کی کتنی ہی باتیں کرتی ہیں اور میں تمہیں آپا کہتی ہوں تو وہ سب کی سب ہنسنے لگتی ہیں۔ جیسے جیسے میری کوئی ماں ہی نہیں۔ میں تو بس یونہی پیدا ہو گئی۔ مجھے بیکار ہی آپا کہنا سکھایا تھا تم نے۔"

شانو روہانسی ہوتی جا رہی تھی۔ رئیسہ پلنگ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پگلی ان باتوں پر دھیان بھی نہ دینا۔ یہ اسکول اور کالج کی لڑکیاں جانے اتنی پاگل کیوں ہوتی ہیں"، رئیسہ نے پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ شانو نے نظر بھر کر ماں کو دیکھا۔ اماں تمہیں میری اماں کہے گا بھی کون۔ تم ٹھیک میری آپا ہی تو لگتی ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ ویسے ہی اسے جانے کیوں SNOW WHITE کی QUEEN آئینہ سے سوال کرتی نظر آنے لگی۔ "MIRROR MIRROR ON THE WALL WHO IS FINEST OF THEM ALL" سنو وہائٹ اگر میں آئینہ ہوتی تو کہتی "میری ماں، میری ماں، میری ماں سے زیادہ خوب صورت کون ہے مگر آج صبح ہی صبح میں نے ایک اکیلی مینا دیکھی ہے۔ جانے آج کا دن کیسا گذرے۔

رئیسہ ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ خدا انہیں دولت دے یا نہ دے حسن بڑی فراخدلی سے عطا کر دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال رئیسہ اور اس کی بہنوں کا تھا۔ بھائی بہنوں کی کثیر تعداد غربت کا پیش خیمہ بنتی جا رہی تھی۔ رئیسہ کے والد شہر سے پرے ہٹ کر قصباتی علاقہ کی طرف رہتے تھے۔ اسی علاقہ کے ایک کھلے میدان میں فوجی ٹریننگ لینے والے جوان پریڈ کرنے آتے تھے۔ رئیسہ ان دنوں میونسپلٹی کے اسکول کے ساتویں درجہ تک ہی پہونچ پائی تھی۔ جو پریڈ کرتے نیازی کی نظریں اس کے گندمی رنگت اور چھلتے جسم سے الجھ کر رہ گئیں۔ اور جیسے ہی انہوں نے سیکنڈ لیفٹینینٹ کا عہدہ سنبھالا وہ رئیسہ کو بیاہ لائے رئیسہ اپنے گھر کی گھٹن اور غربت کی تباہ کن اداسیوں سے چھوٹی تو خود کو کھلے آکاش کا اڑتا ہوا پنچھی محسوس کرنے لگی اور نیازی وہ اسے پہلو میں لے کر چلتے تو دیکھنے والوں کی نظریں دور دور تک ان کا طواف کریں۔

ایسا جگمگاتا حسن نیازی کی ملکیت تھا۔ نیازی کا جی چاہتا کہ وہ چیخ چیخ کر سبھوں سے کہے کہ تم میرے حسین مجسم کو دیکھو میں اس کا شوہر ہوں۔ اس کا مالک ہوں اور یہ میری ملکیت ہے۔ میری بیوی۔

پھر ایسا ہوا کہ چھاؤنی کی بڑی بڑی پارٹیوں اور محفلوں میں نیازی شرمندہ شرمندہ سے رہنے لگے۔ رئیسہ کا ساتھ بس چیڑ اور دیوار کے جنگلوں میں تنہا گھومنے کے لیے ٹھیک تھا۔ لیکن یہ کاک ٹیل پارٹیاں اور بڑے بڑے ڈنر میں ہر طرح کی حماقتیں اس سے سرزد ہوتیں۔ رئیسہ کو آداب اور طور طریقے سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ نیازی اکثر اسے اپنے شامل لے جانے سے کتراتے تو وہ عشق پیچاں کی منڈھی بیل کی طرح نیازی کے پروگراموں سے چپک جاتی۔ رئیسہ کو وہ چمکتی دمکتی پارٹیاں ایسی من بھاون لگتیں جیسے اس کے بچپن میں ساون کے میلے پھر وہ ایسی پارٹیاں کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ نیازی رئیسہ سے بے نیاز ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ رئیسہ سوسائٹی کے آداب سے واقف ہوتی گئی۔ اس نے تعلیمی مراحل بھی طے کئے اور بہت جلد خود اعتمادی پیدا کر لی۔ اب وہ پندرہ سال قبل کی ساتویں جماعت پاس رئیسہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک ایم۔ اے پاس پی ایچ ڈی اسکالر تھی۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ بڑا بیٹا ایک پبلک اسکول کے ہوسٹل میں تھا اور بیٹی شانو کو اس نے بچپن سے ہی آپا کہنا سکھایا تھا جو اس کی چھوٹی بہن ہی معلوم ہوتی تھی۔ رئیسہ ہنسنا بھی جانتی تھی اور رونا بھی۔ اس لیے اسے حصولِ مقصد میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔ وہ گیس بھرے غبارے کی طرح آکاش کی بلندیوں کی طرف پرواز کرتی رہی ـــــ کرتی ہی گئی اور کبھی صحیح اور غلط کے گورکھ دھندے میں نہیں پھنسی۔ "زمانہ بدل چکا ہے"۔ ہر بار ـــــ ہر بار ـــــ اس نے یہی سوچا۔ "سب چلتا ہے ان دنوں"۔ اسے اپنے حسن کا احساس تھا ـــــ اور حسن کی کرشمہ سازیوں کا بھی احساس تھا۔ مگر ڈور کا آخری سرا نیازی اپنی بسم اللہ کی انگلی میں لپیٹے کبھی نیچے کی طرف جھٹکا دیتے تو وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولنے لگتی۔ اس دن ایک جنگ عظیم کھڑی ہوتی۔ شانو ڈرے سہمی گھر کے کونے کھدروں میں چھپی پھرتی۔ اور رئیسہ جس رفتار سے نیچے کی طرف آتی اس کی دوگنی رفتار سے گیس بھرے غبارے کی طرح اوپر کی طرف پرواز کر جاتی۔

"میں اس طرح کب تک جھٹکے دیتا رہوں گا؟ کب تک کب تک۔؟"
نیازی حیران تھے کہ آخر ریبسہ چاہتی کیا ہے۔
میں... میں... چاہتی ہوں نیازی کہ جلد سے جلد کوئی اچھی سروس کروں۔
اور تم دیکھ لینا یہ میں کر کے رہوں گی۔
بھئی زمانہ بدل گیا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اب گھر پر کوئی بیکار بیٹھنا نہیں چاہتا۔
پھر یہ کہ ان دنوں قیمتیں بھی اتنی زیادہ ہوگئی ہیں کہ...
"کس چیز کی قیمت....؟" نیازی بیچ میں لقمہ دیتے۔
بھئی ہر چیز کی... ہر چیز کی۔ قیمتیں کم کہاں ہیں اب؟
"بس تم سے تو باتیں کرنا ہی گناہ ہے۔ خواہ مخواہ ہی کاٹنے کو دوڑتے ہو اسی لیے تو میں تم سے باتیں نہیں کرتی۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ آخر ہمارے تمہارے جاننے والے میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ وہ تو میری باتوں کا اس طرح مذاق نہیں اڑاتے مگر ایک ضد ہے تو تمہیں میری باتوں سے۔"

نیازی ریبسہ کی باتوں کا جواب دئے بغیر ہی آہستہ آہستہ دریچہ کے قریب آکر سگریٹ کے کش لینے لگتے۔ سامنے کھلا میدان تھا۔ اور میدان کے پیچھے اودی نیلی پہاڑیوں کا سلسلہ۔ بیچوں بیچ میدان میں ایک خوب صورت سی لڑکی ہاتھوں میں کتاب اٹھائے چلی جارہی تھی۔ اس کی کمر سے نیچے تک کے بالوں کی ایک چوٹی بندھی تھی۔ نیازی اسے دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ نظروں کی پہونچ سے دور ہوکر خلا میں گم ہوگئی۔ اور اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ایک اکیلی مینا دریچہ کے جنگلے پر آبیٹھی تھی۔ شانو بیکاری سے اکتا کر گھر کے صحن میں رسی کودنے لگتی تھی۔ اس کے اونچے کٹے بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ اسکرٹ کے گھیر میں کبھی رسی الجھ جاتی جسے وہ جھٹک کر ٹھیک کرتی اور کنکھیوں سے منڈیر پر بیٹھی اکیلی مینا کو دیکھتی جاتی۔
آج اتوار کا دن تھا۔ فرصت کا دن۔ شانو کو ریبسہ کا پروگرام معلوم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آج ریبسہ بہت خوش رہے گی اور پروفیسر ورما کے سامنے اپنے ہوش ربا سے

بالوں کو کھولے، آنکھوں میں کاجل کی لکیریں بھرے اس کی OBEDIENT GIRL بنی ہوگی۔ نہ اسے غصہ آئے گا نہ موڈ ہی خراب ہوگا۔ غصہ تو بس اسے نیازی کی باتوں پر ہی آتا تھا اور موڈ بھی جب ہی خراب ہوتا تھا۔ لیکن ورما صاحب کے یہاں تو وہ ایسی خوش مزاج بن جاتی۔ ۔ ۔ ۔ جیسے اس نے کبھی غصہ جانا ہی نہ ہو۔ پروفیسر ورما کی بیٹی رنجنا شانو کی کلاس فرینڈ تھی۔ اور بار ہا شانو رئیسہ کے ساتھ وہاں گئی تھی لیکن ان دنوں تو جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایسی آدم بیزار سی بنتی جا رہی تھی کہ مدت سے وہ رنجنا سے ملنے بھی نہیں گئی تھی۔

" سنو نیازی! میں اپنے پروفیسر کے یہاں جا رہی ہوں۔ مجھے اپنی تھیسس کے کچھ باب سنانے ہیں۔ وہاں سے پھر میں ان کے ساتھ ہی ڈین کے یہاں چلی جاؤں گی۔ تم اور شانو کھانا کھا لینا۔ مجھے کچھ دیر ہو جائے گی۔ ممکن ہے بہت جلد میری نوکری بھی ہو جائے۔ پھر دیکھنا میں کتنی چیزیں خریدتی ہوں۔ کتنے اچھے اچھے فرنیچرس، کراکریز، قالین، ٹی وی اور سچ تو یہ ہے نیازی کہ قالین کے بغیر ڈرائنگ روم ایسے اجاڑ لگتے ہیں۔ کتنی شرمندگی مجھے محسوس ہوتی ہے تمہارے دوستوں کے درمیان یہ تم کیا جانو۔ اور پھر ہم لوگ ایسی ایسی پارٹیاں دیں گے جیسے رانی کھیت کی چھاؤنی میں ہوا کرتی تھیں۔ یاد ہے نا تمہیں نیازی؟

نیازی کوئی جواب نہیں دیتے۔ وہ خاموشی سے جنگلے سے باہر میدان کی طرف تکتے رہے۔ جہاں کبھی ایک سادہ سی خوبصورت لڑکی ہاتھوں میں کتابیں اٹھائے گم ہو گئی تھی۔

شانو زور زور سے نرسری پوئم کے بند دہرا رہی تھی۔ LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN..FALLING DOWN..FALLING DOWN اور صحن کی منڈیر پر ایک اکیلی مینا بیٹھی تھی۔

" سنو شانو! میں کہتی ہوں زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ آخر تم زمانہ کے ساتھ کیوں نہیں چلتیں۔ یہ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ نہ شام کو گھومنے جاتی ہو، نہ کالج کے فنکشن میں حصہ لیتی ہو۔ اور ادھر تو کئی دنوں سے تم کالج بھی نہیں گئیں۔ کل شام تمہیں انوار لینے آیا تو اسے بھی پھٹکار دیا۔ بھلا ایسے بھی کوئی سبھوں سے الگ تھلگ زندگی گذارتا ہے؟

اس طرح تو تمہاری صحت کو گھن لگ جائے گا میری بچی۔ یہ دیکھو میں نے تمہارے لیے کتنی اچھی اچھی ساڑیاں لائی ہیں۔ یہ ساڑیاں پہن کر تم کتنی اچھی لگوگی۔

"اماں! میں یہ ساڑیاں نہیں پہنوں گی۔"

شانو اتنے زور سے چیخی کہ رئیسہ ڈر گئی۔

"کیوں نہیں پہنوگی شنو، کیوں نہیں پہنو گی؟"

اس لیے کہ ساڑیاں پہن کر میں بھی QUEEN SNOW WHITE کی ممن جاؤں گی" شانو خلاء میں تکتی ہوئی بولی۔

"دیوانی جیسی باتیں کیوں کرتی ہو شانو۔ اب اس عمر میں بھی بچوں کی سی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"میں نے ہر دن ایک اکیلی مینا دیکھی ہے اماں۔ کیا تم نے اپنے بچپن میں "ONE FOR SORROW TWO FOR JOY" والا گانا نہیں گایا؟

شانو! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ نیازی ... نیازی ... بھئی اللہ.. کیا تم سبھوں نے چپ کا روزہ رکھا ہے اِدھر آؤ۔ دیکھتے کیوں نہیں۔ یہ لڑکی کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔

"میں بہکی باتیں نہیں کرتی اماں! سچی باتیں کرتی ہوں" شنو اب تک خلاء میں گم تھی۔

"ہائے نیازی! تم نے بچی کا دل نہیں بہلایا۔ اُسے تنہا چھوڑ کر بس اپنی کتاب اور شراب میں ڈوبے رہے۔"

میں تو اپنی پڑھائی اور نوکری کے پیچھے بھاگ رہی تھی اگر اس طرح جان دیکر یہ نوکری حاصل نہ کرتی تو یہ آرام و آسائش کی چیزیں کہاں سے آتیں؟ یہ خوب صورت فرنیچرس، قالین، اور کراکری، یہ فرج اوون اور...

اماں! ان کے بغیر بھی تو ہم لوگ جی رہے تھے۔ پھر ان چیزوں کا ڈھیر لگانا ہی کیا ضروری تھا؟

"میں نے سُنا ہے اماں کہ جب انسان سے سامان زیادہ ہو جاتے ہیں تو سامان

انسانوں کو کھا لیتے ہیں۔

"ہائے شنو یہ تو پاگلوں جیسی باتیں آج کیوں کرنے لگی ہے۔ نیازی! تم آتے کیوں نہیں؟

میری بچی زمانہ بدل گیا ہے۔ ہمیں زمانہ کے ساتھ چلنا ہے۔ رئیسہ بھاگتی ہوئی گئی اور کہیں سے ٹرونکولائزر کی گولیاں اٹھالائی۔

میری بچی! تو یہ ایک ٹکیہ کھالے۔ تجھے نیند آجائے گی۔ پھر تو ایسی دیوانی باتیں نہیں سوچے گی۔

ہاں اماں! زمانہ بدل چکا ہے۔ اور اس بدلتے ہوئے زمانہ میں تم نے اپنی منزل پالی ہے۔ لیکن میرا زمانہ ٹرونکو لائزر کی گولیاں بن گیا ہے۔ اور میری منزل اس کی دھندھ میں غائب ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ میں نے ہر دن ایک اکیلی بینا دیکھی ہے۔

محض تماشائی

آج پھر صولت کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ ایک دن قبل ہی اس نے نمی کو روانہ کیا تھا۔ کیونکہ اس کا اسکول کھل گیا تھا۔ لیکن سجاد کا ایک طویل خاموشی کے بعد خط بھی ملا تو جلا کٹا لکھا تھا۔

"نمی ابھی تک نہیں آیا!! اس کا اسکول کھل گیا ہے۔ لیکن تمہیں اپنے رونے سے فرصت کہاں جو ان باتوں پر دھیان دو کس کس طرح تم ایک بچے کی زندگی برباد کر رہی ہو۔ خیر جیسی تمہاری مرضی۔"

صولت کی آنکھوں سے جلتا جلتا لاوا بہنے لگا۔ یادوں کے گدلے سمندر اس نے کھنگال ڈالے۔ اس کی تہہ میں ان گنت خزانے، تصور کے شکستہ ٹکڑے اور امیدوں کی لاشیں دفن تھیں۔ اس کے بند بند ہونٹ پھڑپھڑائے اور بڑے ضبط سے وہ گنگنانے لگی۔

اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

شعر کی رومانی فضا نے اس کے دل میں خوشی کی ایک چھوٹی سی مدھم سی لہر پیدا کی۔ لیکن شعر کی حقیقت نے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ سچ ہی تو تھا کہ وہ اپنے دل کے تمام لطیف و حساس جذبوں کے ساتھ ایک بت مرمر سے جا ٹکرائی تھی۔ صولت نے دلِ دیوانہ کو پھر سمجھایا

اور نقشِ فریادی کی ورق گردانی شروع کر دی۔ خوشی جو اتنی معدوم اتنی موہوم اتنی بیگانہ سی چیز ہے اگر کوئی اچھا سا شعر پڑھ کر حاصل ہو جائے تو کیوں نہ غم بھلایا جائے۔ اپنے خیال پر وہ آپ ہی آپ مسکرائی ویسے ہی اسے شبو باجی کی بات یاد آگئی۔ کل ہی تو وہ کہہ رہی تھیں۔
"کیوں جی صولت! تمہارا دل کیا اندر سے بہت خوش رہتا ہے۔ جو تم اتنا ہنستی ہو؟"
ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اور آنکھوں کے ستارے ٹمٹمانے لگے۔ ان کے جلتے بجھتے تاروں کی روشنی میں اسے وہ ہنگامہ خیز رات یاد آئی۔ جب وہ ڈری سہمی بے خودی کے عالم میں سرخ کپڑے پہنے پھولوں سے لدی بیٹھی تھی۔ درجنوں بھر لڑکیاں تالی پیٹ پیٹ کر ڈھول بجا بجا کر میراثنوں کے مقابلہ میں گانا گائے جا رہی تھیں۔ اور پروفیسر مسز شہنواز کی باتیں یاد کر کے اس کے کان کی لوئیں گرم انگارہ ہو گئیں۔ کس لاپرواہی سے انہوں نے کہا تھا:
"اس ہنسوڑ کا کیا ہے یہ تو اپنی رونمائی کے وقت بھی ہنسے گی۔" پروفیسر کی بات پر لڑکیوں نے ایک طویل قہقہہ لگایا تھا۔ وہ بھی تو دل کھول کر ہنسی تھی مگر اب جلدی جلدی سورۃ ناس پڑھ رہی تھی۔ خدا نخواستہ اگر اسے واقعی ہنسی آگئی تو؟ نہ جانے کب اس کا گھونگھٹ اٹھا اور گرا لیکن جب دوبارہ اٹھایا گیا تو جیسے اسے ہوش آگیا اور وہ مسز شہنواز کی کلاس سے نکل کر اچانک ہی شادی کے ہنگامہ خیز ماحول میں پہونچ گئی۔ اپنے چہرے کی کھنچاوٹ کا احساس ہوا تو کانپ کر اس نے اپنا چہرہ سنجیدہ بنا لیا۔ کیا واقعی وہ مسکرا رہی تھی؟ تشویش ناک لمحہ گذر گیا۔ سجاد اس زیرِ لب تبسم کے پہلے ہی وار کا گھائل ہوا۔ اور بڑی مشکلوں سے جب اس نے صولت کی آدھ کھلی آنکھوں میں جھانکا تو صاحب فراش ہو گیا۔ بڑے والہانہ پن سے اس نے کہا۔
"صولت! جو دل محبت سے اس قدر بیگانہ تھا۔ تمہاری ایک ہی نظر نے اس میں محبت کے سوتے جگا دیئے۔"
ایک بے تحاشا قسم کا قہقہہ صولت کی ہونٹوں پر آتے آتے رکا۔ ضبط سے اس کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ ایک ہی نظر میں گھائل ہونے والا حادثہ تو لیلیٰ مجنوں کے زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ آپ حضرت کس زمانہ کے مجنوں ہیں۔ آنکھوں میں ہریل طوطوں کی سی چمک لا کر صولت

نے بڑی مشکل سے اپنی زبان کو قابو میں رکھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی آنکھیں جھک گئیں اور چہرے پر بجلی کی لالی لپک جھپک گئی۔ وہ دل ہی دل میں ڈری اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں کہ بمبئی ٹاکیز کی فلموں کی طرح وہ اپنے ہیرو کے ساتھ ڈوئیٹ گاتی پھرے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی بد ذوقی پر اس نے کڑھ کر سوچا۔ اسے اپنے کالج کے مکمل چار سال کے کارنامے یاد آئے۔ کیسے کیسے مجنوؤں کو اس نے محض اونہہ کر کے جھٹک دیا تھا۔ اسے عشق و محبت کی داستان سے وحشت ہوتی تھی بھلا یہ کیا کہ نظریں ملیں اور عشق کا پھندا گلے میں۔ اور اگر عشق ہی کرنا ہو تو پھر افلاطونی عشق ٹھیک ہے۔ لیکن سجاد کو تو جیسے صولت کی پہلی ہی جھلک میں محبت کا روگ لگ گیا۔ وہ بے تحاشا اس کے حسن کی قصیدہ خوانی میں مصروف رہا۔ ہر رات وہ خوب صورت جملے تراش خراش کر اس پر نچھاور کرتا رہا۔ ایسے ہی وقت کے کسی گذرتے لمحہ میں اس نے صولت کے بالوں کو بکھرا کر کہا۔

"تمہارے بالوں میں بادام کی رنگت اور تمہارے چہرے میں گلاب اور چاندنی کی آمیزش ہے" ادب کی طالبہ نے اپنے بالوں کی خوب صورتی پر دھیان دیئے بنا اس کی تشبیہوں کو سراہا۔ نیند سے بوجھل ذہن کو پرے دھکیل کر سجاد کا جملہ یاد کرنے لگی اور جلد ہی نیند کی آغوش میں جھکورے کھا گئی۔ سجاد کا دل خون ہو گیا۔ "لڑکی ہے یا قطب شمالی" اس نے جل کر سوچا اور تمام رات غصہ میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ صبح صولت جاگی تو سجاد اس کے قریب ویسا ہی بیٹھا تھا۔ پاس کے ٹیبل پر رکھا ایش ٹرے سگریٹ کے جلے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ بال بے ترتیبی سے اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ چہرے پر بے خوابی کی کساوٹ تھی اور آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے۔ صولت ہڑبڑا کر اٹھی اور کچھ خوف زدہ ہو کر اس نے سجاد کی طرف دیکھا۔ پھر کتنے ہی سوالات کی بوچھار کر دی۔

"آپ سوئے نہیں؟ آپ کی آنکھیں اتنی لال کیوں ہیں؟ آپ نے اتنے سگریٹ کیوں پی لئے؟"

سجاد ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

صولت پتھر سی بن گئی۔ اس نے تاسف سے سجاد کی طرف دیکھا۔ چہرے پر وہی ویرانی اور بے خوابی کی کساوٹ تھی۔ یہ روٹھا روٹھا مجنوں اسے اچانک ہی اچھا لگنے لگا۔ کانٹا چبھ کر دل میں ٹوٹ گیا۔ اب انجان بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔

اور دن گذرتے گئے۔ ہنستے کھیلتے، قہقہہ لگاتے صولت سجاد کے گھر کے سبھی دشوار گذار راستے پار کرتی گئی۔ ہر چوٹ اور ہر ٹھوکر پر ہنس کر اس نے اپنے زخمی پاؤں کو جھٹکا اور آگے بڑھ گئی وقت گذرتا گیا۔ آبلے پڑتے رہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، کون سا کانٹا چبھا کہ بے اختیار اس نے اپنا پاؤں کھینچ لیا۔ وہ تھک کر بیٹھ گئی اور دل میں سوچا کہ بس اب وہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔ یہ سجاد کا گھر تو نہیں، اس کا اپنا جھونپڑا تو نہیں، یہ تو اس کے ابو کا محل ہے، جہاں طرح طرح کی مخلوق ہے۔ رنگ برنگے لوگ ہیں۔ جو خواہ مخواہ ہی خالی برتنوں کی طرح ڈھن ڈھنایا کرتے ہیں۔

اس رات صولت نے انگلیوں پر دھڑا دھڑ گن کے سجاد کو بتایا کہ وہ تیرہ سال تک غلط راستوں پر بھٹکتی رہی۔ محض غلط جگہوں میں رہتی گئی۔ لیکن اب تو اسے اپنا گھر چاہیے۔ بالکل اپنا گھر۔ جیسے وہ خود اپنی مرضی کے مطابق سجائے گی جیسے جی چاہے رہے گی۔ دوسروں کی خواہش پہ انسان بھلا کب تک جیے۔ سجاد بوکھلا گئے۔ بھلا یہ بیٹھے بیٹھائے اپنے گھر کی کیا سوجھی صولت کو۔ مانگنا ہی تھا تو کوئی قرینہ کی چیز مانگتی۔ جگمگاتی چیزوں سے دکانیں بھری پڑی ہیں۔ زیور، کپڑے، ساڑیاں، فرنیچر، کراکریز خوب صورت پردے ..... لیکن اوہ، کراکریز اور فرنیچر کا کیا کرنا ہے اسے۔ ان چیزوں کو رکھنے کی اب اس گھر میں جگہ ہی کہاں۔

تو پھر کیا ہوا زیور اور کپڑے ہی بنا لیتی۔

زیور اور کپڑوں کا نام سن کر صولت بھڑک اٹھی۔

"اجی حضرت! میں بالکل بور ہو گئی ہوں ان زیورات اور کپڑوں کی آرائش سے۔ میں تو خود اپنے زیورات بیچ کر پردے قالین اور فرنیچر خرید ڈالوں۔ مجھے ان زیورات کا کیا کرنا

کیا مجھے کوئی زمیندارن سمجھ رکھا ہے جنہیں زیورات تڑوانے اور گڑھوانے کے سوا کوئی کام نہ ہو۔"

اپنے گھر کی دبی دبی خواہش شدت اختیار کرنے لگی اور شدت بعد میں جنون بن گیا۔ صولت پہ جنوں طاری ہوا تو مجنوں کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے علم کا سارا خزانہ اسی سوچ میں صرف کر دیا کہ صولت کی ضد جا ہے یا بے جا۔ بھلا وہ اپنے والدین کا گھر کس طرح چھوڑ سکتا تھا اور والدین بھی وہ جو صبح و شام اٹھتے بیٹھتے قرآن شریف کا حوالہ دے کر اولاد کو اس کے فرائض سے آگاہ کرتے۔ پھر شہر اور محلہ والوں کے ڈر نے بھی سجاد کے قدم متزلزل کر دیئے۔ بھلا وہ لوگ کیا کہیں گے۔۔ یہی نا کہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر بیوی کے ساتھ الگ گھر بسا لیا۔ ہزار طرح کی چہ میگوئیوں کا خدشہ سجاد کو پکڑ لیتا۔

صولت نے جل کر سجاد کو اس کے سبھی بھائیوں کا طعنہ دیا سبھی تو اپنے اپنے گھر، اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ رہتے تھے لیکن اس کی لبوں پر ناچتی پھڑکتی مسکراہٹ، ہر بات پر کھلکھلا اٹھنے کی ادا اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا بن گئی۔ وہ ایک ایسی بہروپیا تھی۔ جو ہر رنگ میں آسانی سے رنگ جاتی کبھی سیدھی سادی گھریلو عورت، کبھی چمکتی دمکتی کوئی ایسا شو پیس معلوم ہوتی جو ہر طرح کے ڈرائنگ روم میں سجائی جا سکتی۔ اس کی نندولا کی عمر دراز ساس اماں آئیں تو ان کا دل صولت کی باتوں میں کھنچتا۔ اس کے دیور کے بے تکلف دوست آتے تو انہیں بھابھی کی یاد ستاتی۔ سجاد کے دوستوں کا تو خیر کہنا ہی کیا اس کے سسر کے دوست بھی آتے تو انہیں صولت کے ہاتھ کی بنی چائے پسند آتی اور اسے بھی محض اتفاق ہی کہیئے کہ اس کے ہاتھوں کی بنی چائے پسند کرنے والے اس کے سسر کے دوستوں میں اکثر ادب نواز ہی ہوتے۔ کمشنر صاحب اپنے زمانہ کا جب کوئی یادگار واقعہ سنا رہے ہوتے تو شمسی صاحب پوچھتے:

'وہ بھلا کون سا شعر تھا جو اس دن آپ سنا رہی تھیں۔ بے حد لطیف سا۔" کمشنر صاحب کی باتیں ادھوری رہ جاتیں اور سجاد اور صولت کسی شاعر کا جھگڑا لے بیٹھتے۔ یا جب کمشنر صاحب نہایت اہتمام سے اپنے داڑھی رکھ لینے کے واقعہ کو مکہ معظمہ کے حالات

کے ساتھ سنانا شروع کرتے تو صولت روہانسی ہوکر کہتی :

" دیکھیے نا چچا جان! اب تو داڑھی کی وجہ سے ہم لوگ کو ابو سے اور بھی ڈر لگنے لگا ہے۔"

کمشنر صاحب خوش دلی سے ہنستے اور "چچا جان" کہلانے پر جتنا دل گرفتہ ہوتے صولت کی باتوں سے اتنا ہی محظوظ۔ وہ ذرا بے تکلفی سے باتیں کرتے تو صولت ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی ہیں بھلا بزرگوں سے ایسی گستاخانہ باتیں کروں۔ فیاض صاحب جل جاتے اور صولت ہنستے ہنستے لوٹ جاتی۔

سجاد کی جان ایک عذاب میں مبتلا ہوگئی۔ ایک طرف صولت تھی اور ایک طرف اس کے آئیڈیل ابو۔ صولت کو سمجھا سمجھا کر وہ ہار گیا لیکن اس کی وہی ایک ضد کہ چھوٹے بچہ کی طرح چندا ماما لینے کو مچل گئی۔ اب جو سجاد سونے سے قبل کوئی اچھا سا شعر اس کی نذر کرنا چاہتا تو وہ بڑی بد دماغی سے اس کے گھر کے طور و اطوار میں کیڑے نکالنے لگتی۔ سجاد کا شاعرانہ موڈ خاک میں مل جاتا۔ اور وہ چڑھ کر کہتا تمہیں یہ گھر پسند نہیں تو اپنے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں۔

اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ کانٹا ایسا چبھا کہ صولت خاموشی سے اٹھی، سوٹ کیس میں کچھ کپڑے ڈالے اور اپنی امی کے یہاں جانے کو تیار ہو گئی۔ سجاد اسے اسٹیشن تک چھوڑنے آیا۔ دونوں بجھے بجھے خاموش خاموش تھے۔ صولت کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ ٹرین چلی تو اس نے ہلکی سی سسکی لی اور آنسوؤں کی برسات آگئی۔ اس رم ٹپ رم ٹپ بوندوں میں سجاد کا چہرہ دھندلا گیا۔ تین گھنٹے کے بعد وہ گھر پہونچی تو اس کی امی اسے دیکھ کر کھل گئیں لیکن صولت کا دل اندر ہی اندر سلگ اٹھا۔

...... اور اب ایک طویل خاموشی کے بعد سجاد کا خط ملا بھی تو جلا کٹا۔ نقش فریادی کی ورق گردانی کرتے کرتے بڑی بیزاری سے کتاب اپنے چہرے پر ڈال کر وہ دیر تک سوتی جاگتی رہی۔

ہفتوں گذر گئے۔ اس نے سجاد کے خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر ایک دن اکتا کر

خود ہی اسے خط لکھنے بیٹھ گئی مختصر سا خط۔ آخر اس کی خیریت دریافت کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس نے دل کو تشفی دی جلدی ہی جواب آگیا۔ لکھا تھا:

"۔۔۔۔ میں کسی طرح زندہ ہوں۔ کام بہت ہے۔ امتحانات کے پرچوں کا انبار لگا ہے میں نے سمجھا تھا کہ شاید نمی کے ساتھ تم بھی آؤ گی لیکن نمی ننھا ہی آیا۔ آج کل مجھ میں اور بے خوابی میں جھڑی دوستی ہے۔"

صولت کا دل چاہا وہ بھاگتی بھاگتی جائے اور سجاد کے کاموں میں مدد دے۔ آخر سجاد کی آنکھوں کی نیند کون چرا لے گیا؟ کیا سجاد اسے یاد کرتا ہوگا۔؟ بڑی بے یقینی سے اس نے سوچا کڑوی کڑوی مسکراہٹ نے آنکھوں میں تارے جھلملا دیئے اور وہ خط کا جواب دینے بیٹھ گئی۔ موسم تپ رہا تھا دس بجے دن سے ہی ہوا گرم تھی صولت نے دکان سے خریدے ہوئے پیکٹ سنبھالے اور جانے کے لیے مڑی۔ ویسے ہی اسے شوخ شوخ نظروں سے تکتے ہوئے فیاض صاحب نظر آئے۔

"ارے چچا جان! سلام علیکم" وہ خوش دلی سے مسکرائی "کہیے خیریت مزاج؟"

"جب آپ سامنے ہوں تو خیریت کہاں" وہ ہنس کر بولے پھر کچھ دھیمی آواز میں نہ جانے کیا کہا کہ صولت نے اپنا سر پیٹ لیا۔ شن شن شن گرم لو کا جھونکا اس کے دماغ کے ہر گوشے میں سنسنانے لگا۔

اونہہ مجھے اتنا وقت نہیں کہ آپ کی واہیات خرافات سنتی رہوں۔"

وہ بد دماغی سے لال بھبھو کا چہرہ گھما کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ گھر وہ کچھ بدحواسی کے عالم میں پہونچی۔ اور بستر میں منھ چھپا کر دھواں دھار رونے لگی۔ "بھئی اللہ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے ان رشتوں ناتوں کی یہ کیا کہ بڑے ماڈرن بنے پھرتے ہیں۔ اور جس کے جو دل میں آئے کیے جاتے ہیں

سامنے ہی ٹیبل پر سجاد کا خط رکھا تھا۔ اس نے لپک کر خط اٹھا لیا۔ لکھا تھا:

"۔۔۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ سوتے میں نہ جانے کیوں چونک چونک اٹھتا ہوں۔ شاید زندگی اور موت کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ باقی ہے۔

اب تو ان کاموں سے بہت جلد تھک جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

صولت کانپ گئی۔ تھکن کے نام سے نفرت کرنے والا سجاد اب بہت جلد تھک جاتا ہے۔ دیر تک وہ بستر پر آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑی رہی۔ لیکن اس کا ذہن جاگ رہا تھا وہ سوچ رہی تھی۔ تصورات کی پوری تیز رفتاری کے ساتھ۔ اسے فیاض صاحب سے ڈر لگنے لگا تھا۔ کیسے دلیر بنے تھے وہ سجاد کی غیر حاضری میں اور پھر اسے تنہا پا کر نہ جانے اور بھی کتنے فیاض صاحب پیدا ہو جائیں۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل چلی جائے گی سجاد کے پاس جہاں نمی ہے۔ ٹھیک ہے آج ہی ٹیلی گرام دے دوں اور امی سے بھی کہہ دوں۔

اس کی امی اس کے اچانک جانے کا پروگرام سن کر حیران ہو گئیں۔ بگڑ کر بولیں۔ "جانا ہی ہے تو دو چار دن بعد چلی جانا۔ یہ کل ہی کی ضد کیوں؟" لیکن صولت سوچ رہی تھی جو کسی طرح آج ہی امی جانے دیتیں۔

اسٹیشن پر سجاد موجود تھا۔ بالکل تنہا۔ ہمیشہ وہ اپنی پوری بٹالین کے ساتھ رہتا تھا۔ صولت نے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن سجاد کے آنکھوں کی چمک نے اسے اس تنہائی کا مطلب سمجھا دیا۔

"اچھا ہوا جو تم آ گئیں ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ورنہ کیا؟"

"کچھ نہیں ڈرتا ہوں کہ جو تم پھر ناراض ہو کر چلی گئیں تو مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔"

صولت نے ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہاں پیار ہی پیار تھا۔ زندگی مزے میں گذرنے لگی۔

صولت نے "اپنے گھر" کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا۔ کم از کم سجاد کی موجودگی میں وہ خیال اسے کبھی نہیں ستاتا، لیکن باتیں کرتے کرتے اکثر وہ چپ ہو جاتی اور چونک کر پوچھتی۔

"اوہ کیا کہا؟ میں نے سنا ہی نہیں۔" اس کی آنکھیں کسی خلاء میں نہ جانے کیا جھانکتی رہتیں۔ اس کی بے ساختہ ہنسی میں اب ایک تھکاوٹ کا احساس ہوتا۔ وہ رک رک کر

ٹھہر ٹھہر کر بڑے اہتمام سے ہنستی تو اس کی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگتی جسے وہ بڑی لاپرواہی سے ٹال جاتی۔ ایک عجیب سی کمزوری اور تھکن کا احساس تھا جو اس کے صحت مند جسم کو جکڑے جا رہا تھا۔ کبھی تیز تیز دھڑکنوں کے ساتھ اس کے سینہ میں درد ہوتا۔ وہ بے چینی بے چین رہتی۔ سجاد ڈاکٹر کو بلانا چاہتا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور بگڑ کر کہتی "بھئی اللہ! میں نے ہزار دفعہ کہہ دیا نا، کہ مجھے پیٹ کا عارضہ ہے۔ پھر بھی نہیں سمجھتے۔ بس ابھی اِنو (ENO) پی لیتی ہوں اور وٹامن ایم منگالوں گی۔ ڈاکٹر کی مطلق ضرورت نہیں۔

آج بھی وہ دل کی دھڑکن تیز محسوس کر رہی تھی۔ تمام دن اس نے خود کو طرح طرح کے کاموں میں الجھائے رکھا۔ رات آئی تو خلاف توقع زیادہ ہی تاریک تھی۔ صولت کے دل کی دھڑکن بڑھتی ہی گئی اور درد سے سینہ کٹنے لگا۔ جسم پسینہ سے شرابور اور ہونٹ نیلا ہو گیا۔ سجاد صولت کے روکنے کے بعد بھی ڈاکٹر کو بلانے چل دیا۔ ڈاکٹر آیا تو مریض کے درد میں بھی کمی آئی۔ لیکن اس طرح کہ آہستہ آہستہ اس کی نبضیں ہی چھوٹ گئیں۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اس نے سجاد کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے تاسف سے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا:

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حرکت قلب کے بند ہونے کی پہلی علامت موت ہی ہوتی ہے" سجاد نے وحشیانہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا اور تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس کی ماں سینہ پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی
"ہائے میرے گھر کی رونق چلی گئی
میری ستی ساوتری جیسی بہو چلی گئی۔"

حصار میں

لمبی چوڑی حویلیاں اونچے اونچے حصار، رہائش گاہ کا ہے۔ کوٹھیں اچھے خاصے جیل خانے تھے، آنگن در آنگن دروازے کھلتے جاتے، فاصلے میلوں میں بدل جاتے تب کہیں جا کر حویلی کا آخری سرا نظر آتا تھا، پھر بھی خزانے ہاتھ نہ آتے۔ شاید سم سم کا دروازہ کھول چور سارے ہی خزانے لوٹ لے گئے تھے۔ اور اب دھرا کیا تھا یہاں سوائے نگوڑے مار اجاڑ حویلیوں کے، جن کی دیواروں کی پلاسٹر یں جھر جھرا رہی تھیں اور مرمریں فرش کی ٹائلیں جگہ جگہ سے چٹخ رہی تھیں۔ لیکن یہ قیامت صرف فرش اور ٹائلوں پر ہی نہیں ٹوٹی تھی، یہاں تو زندگی ہی چٹخ گئی تھی۔ دراڑیں صرف دیواروں ہی میں نہیں آئی تھیں بلکہ حویلی کی ساری روایتیں اور تہذیب ہی تڑخ گئی تھیں۔

۱۹۴۷ء سے بہت قبل کی بات ہے کہ جس زمانہ میں اکبر الہ آبادی اپنی صیقل کی ہوئی زبان سے انگریزوں پہ بڑھ کر وار کر رہے تھے، ان ہی دنوں نور الزماں خاں صاحب کے دادا رشید الزماں خاں انگریزوں سے خطابات، انعامات، قصبات اور نوکریاں وصول کر جھولیاں بھر رہے تھے۔ اور اپنے خاندان والوں کو مٹھیاں بھر بھر کے تقسیم کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے خاندان والے اور عزیز و اقارب انگریزوں کی

نظرِ عنایت سے بامِ عروج تک پہنچے اور ایسی لمبی چوڑی حویلیاں اور رہائش گاہیں تعمیر کروائیں کہ کہ ان کے دور دراز کے رشتہ دار اور غریب و مجبور بندوں کی کھلی رہائش یہاں ہمیشہ ہوتی رہی۔ کبھی کبھی کچھ مسافر جو راستہ بھٹک کر ادھر آنکلے وہ جناب رشید الزماں خاں صاحب کے حسنِ سلوک سے ایسے مرعوب ہوئے کہ وہیں کے وہیں بس گئے۔ اس طرح مسلمانوں کی ایک بہت بڑی آبادی گنگا کے کنارے بسے ہوئے رام اور سیتا کے دیش میں بنتی گئی۔ کہتے ہیں کہ اگر خاندان کا ایک فرد بھی خدا کا بندہ مقبول بندہ ہو جائے تو وہ اپنے تمام خاندان والوں کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوتا ہے۔ وہ خاندان بھر کے گناہ بخشواتا اور دونوں جہان کی جنتوں میں اُن کی جگہیں محفوظ کراتا ہے۔ تو جناب رشید الزماں خاں صاحب بھی خدا کے ایسے محبوب بندے تھے۔ ان کا دل ایسا پاک صاف تھا جیسے کندن۔ انھوں نے اپنے اعمال اور اپنی عبادتوں سے خدا کو جیتا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ تلاوتِ قرآن شریف میں مشغول رہتے۔ ظہر اور عشاء کی نماز میں مکمل بارہ اور سترہ رکعت ادا کرتے۔ اس کے علاوہ چاشت اور تہجد کی نفلیں بھی فرض سمجھ کر پڑھتے تھے۔ جس زمانے میں چند گنے چنے ہندوستانی ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ رشید الزماں خاں صاحب نے اپنی محنت و مشقت سے وظیفہ حاصل کر کے بی۔اے تک تعلیم مکمل کی اور جب کہ صرف گنے چنے ہی اونچی نوکریاں پاتے تھے۔ انھوں نے ڈپٹی مجسٹریٹ جیسا قابل قدر عہدہ سنبھالا تھا۔ اتنا ہی نہیں اپنے بہت سے خاندان اور جان پہچان والوں کو سرکاری وکیل سے لے کر پٹواری تک کے عہدہ تک بھی پہنچوایا تھا۔ انھوں نے کہیں پڑھا تھا کہ خدا کے نزدیک یہ نہایت مستحب ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان بندہ کی مدد کرے۔ انھیں دوسروں کی مدد کرنا بے حد پسند تھا۔ جب کبھی وہ کسی کی مدد کرتے تو ان کا دل باغ و بہار بن جاتا۔ برٹش راج نے ان کے کاموں کے صلے میں انہیں C.I.E کے خطاب سے نوازا تھا۔ اگرچہ یہ خطاب اس طرح ملا کہ جب انہیں خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تو خوش ہو کر پارٹیاں دینے کے بدلے انھوں نے اپنے کام کے سلسلے میں اسے اپنی بے عزتی سمجھا اور یہ کہہ کر خطاب لوٹا دیا کہ میں تو خود ہی خاں ہوں، بھلا اس خطاب کا کیا کرنا ہے مجھے۔ انگریز گورنمنٹ

نے بھی جب ان کا ٹائٹل دیکھا تو حیران رہ گئی کہ یہ ہندوستانی بھی کچھ عجیب سی مخلوق ہوا کرتے ہیں کہ یہاں فرد نہیں بلکہ ساری قوم ہی باکمال ہوتی ہے۔ بہرحال کچھ ہی دنوں بعد انہیں O.I.E کا خطاب ملا جسے انھوں نے بھاری شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا اور پارٹیاں دیں۔ ان کی شدید خواہش تو یہ تھی کہ وہ بھی بڑے بڑے انگریزوں کی طرح ' سر رشید خاں ' کہلاتے۔ ان کی نظریں ہمیشہ بلندی پر ہی رہتی تھیں اور شاید اسی لیے ان کے بازو میں بھی توانائی تھی۔ وہ ہمیشہ اونچے اونچے ہی ہوتے گئے پرواز ابھی اور ..... ابھی اور ... ابھی اور ' پرواز مکمل کہ علامہ اقبال نے بھی تو ستاروں پر کمندیں پھینکنا سکھایا تھا۔ وہ اردو، فارسی اور عربی کے بڑے اچھے اسکالر مانے جاتے تھے۔ (اور انگریزی تو انھوں نے پڑھی ہی تھی) لہٰذا وہ اقبال کی نظمیں جھوم جھوم کے پڑھتے کہ شاید وہیں کہیں کچھ بھول چوک ہو گئی اور رشید الزماں خاں صاحب اقبال کی فلسفہ خودی ' بے خودی اور نطشے کی خودی میں کچھ گڑبڑا سے گئے۔ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ ' ترقی کے متعدد زینے طے کرنے کے ساتھ ساتھ جناب رشید الزماں خاں صاحب کا 'میں' ایسا جاگا کہ "خودی" "انا" میں بدل گئی اور اقبال نطشے بن گیا۔ بہرحال ایک طرف رشید الزماں خاں کا 'میں' اپنے عروج پر تھا اور دوسری طرف اپنی ان کی بھلائی نیک نامی اور عبادتوں کے فیض سے ان کا نام دن بدن روشن ہوتا جاتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مصروف ترین شخص تھے۔ مگر ان کی عبادتوں سے ان کی مصروفیتوں میں کوئی خلل نہیں آیا تھا۔ کہ وہ اپنی عبادت کے وقت دنیا کے ہزار کام بھی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے کہ اللہ کو راضی خوشی رکھنے ہی میں نجات تھی۔ مگر جناب رشید الزماں خاں صاحب کو نجات ملی کہ نہیں یہ خدا کا بھید تھا کہ وہ حویلی کو دور تک پھیلاتے۔ اونچی عمارتیں تعمیر کراتے اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔

جناب رشید الزماں خاں صاحب اپنی اولاد در اولاد کے لیے خاندان در خاندان کے لیے بہت کچھ کر گئے تھے۔ خوب صورت ٹائلوں سے مرصع عمارتیں، دور دور تک پھیلی ہری بھری کھیتیاں اور چنندہ قلمی آم کے کے باغیچے۔ مگر وہ صرف آم و امرود کے ہی

باغیچے نہ تھے بلکہ ہر موسم کے خوش ذائقہ پھل وہاں موجود تھے۔ ان باغیچوں میں اکثر جشن منایا جاتا تھا۔ خاص کر جب آم کے درختوں پر منجر آتے تو مشہور قوال بلوائے جاتے۔ دیگوں میں کھانے تیار ہوتے، شہر کے معزز مہمان آتے جناب رشید الزماں خاں کی سخاوت و نفاست کی داد دیتے۔ ان کا جام صحت پیتے اور دعوتیں نوش کرتے۔ اس وقت تک جشن مناتے اور قوالیاں سنتے جب تک صبح کاذب کی دھند میں کویل کی کوک نہ گونجنے لگتی۔ اس زمانے میں حویلی کی عورتیں چہار دیواری کے اندر ہی رہا کرتی تھیں۔ باغوں کی طرف نظریں اٹھانا بھی ان کے لیے گناہ تھا۔

جناب رشید الزماں خاں صاحب کے انتقال کے بعد ان کی تمام جائدادوں کے حقیقی وارث تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ٹھہریں۔ پہلے جائداد کا بٹوارہ ہوا پھر گھر کے فرنیچر کا۔ برتن بانٹے گئے پھر بھی بڑی بڑی دریاں اور قالین بچ رہیں۔ کچھ بھاری خوبصورت قالینیں اور قیمتی چینی کے برتن اور گلدستے تو بہنوں نے کہیں چھپا دیے۔ مگر بڑی بڑی دریاں اور جازم تیز قینچی سے کاٹ کر بانٹی گئیں یہاں تک کہ قینچی کے دونوں تیز دھار تلے بھائی بہنوں کے دل بھی آ گئے۔ کہ جناب عظیم الدین خاں، معین الدین خاں اور چھوٹے والے امین الدین خاں میں سے ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ جائداد کا سب سے ناقص حصہ ہی انہیں ملا۔ بہنیں بھی آس پاس ہی بیاہی گئی تھیں انھیں رشید الزماں خاں صاحب نے زمیں جائداد دے کر قریب ہی بسا دیا تھا۔ اس طرح دور دور تک ان کی اپنی بستی بسی ہوئی تھی، بہرحال حویلیوں کے درمیان دیواریں کھڑی کی گئیں، باغوں میں حصار کھینچے گئے اور بٹوارہ مکمل ہو گیا۔ مگر دعوتیں جاری رہیں بلکہ دعوت و ضیافت کا ایک مقابلہ سا چل نکلا پھر یہ مقابلہ ہی مستقل زندگی بن گیا۔ عید پر منجھلے ابا کی بیٹیوں نے جیسے کپڑے بنوائے تھے ویسے ہی میں بھی ضرور بنواؤں گی۔ چھوٹے ابا کے بیٹے نے ایئر رائفل خریدا ہے اماں! مجھے بھی ویسا ہی منگوا دو پھر دیکھو میں تمہیں کتنے تیتر اور بٹیر کھلاتا ہوں۔

عظیم الدین سوچتے 'امین الدین چھوٹا ہو کر سارے فرنیچر بدلوا رہا ہے' تف ہے مجھ پر کہ میں ویسے ہی گھسے پٹے انداز میں رہتا جاؤں۔ نہیں .... نہیں۔ اب کے عید سے

قبل حویلی کو از سر نو سنوارنا ضروری ہے۔

رشیدالزماں خاں صاحب کے تینوں بیٹے اور پانچ بیٹیوں میں سے کے بڑے اچھے دن دیکھے تھے سو وہ حساب کتاب میں بھی بڑے فراخدل تھے۔ روپیہ وہ ٹھکریوں میں لٹاتے رہے اور ہمیشہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ نصف سے زائد زندگی انھوں نے خوشحالی میں گزاری لیکن جب ان کے اپنے بیٹا بیٹی جوان ہوئے تو وقت نے اچانک ہی ایسا پلٹا کھایا کہ وہ انگشت بدانداں رہ گئے یا انھوں نے وقت کو سمجھا ہی نہیں اور وہ دبے پاؤں اس طرح سرک گیا کہ وہ منہ تکتے ہی رہ گئے۔ اچانک انہیں بڑھتی ہوئی گرانی اور اپنے خالی جیبوں کا احساس ہوا۔ ضروریات زندگی نے ایسا چولا بدلا تھا کہ وہ نت نئے انداز میں سامنے تھر کتے لگتی۔ ادھر ان کی اپنی اور جناب رشیدالزماں خاں صاحب کے پوتوں اور نواسیوں نے جیسے ساری حصاریں ایک ساتھ ہی پھلانگ لینے کی قسم کھائی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ گھر کی عورتوں نے بھی ڈرتے ڈرتے باہر کی طرف جھانکا پھر جھجکتے قدموں سے آگے بڑھیں پھر کھلم کھلا باہر آگئیں کہ یہ وقت کا تقاضا تھا۔ لڑکے لڑکیوں کو بہت کچھ سیکھنا اور آگے بڑھنا تھا۔ اسکول کالج کی تعلیم حاصل کرنی تھی کہ اب وہ بند دریچوں والا رخصت ہو گیا تھا۔ اب ان حصار کھنچے ہوئے باغیچوں میں جن کے درخت کسی حد تک خشک ہو رہے تھے۔ لڑکیوں کے غول کے غول نظر آتے، کیریاں چنتیں، درختوں میں جھولا ڈالے لانبے لانبے پینگ لیتیں، نئے نئے ڈیزائن کے خوب صورت کپڑے پہنے، گھنیری زلفیں کھولے سجی سجائی لڑکیاں۔ مگر وہ لڑکیاں کاہے کو تھیں، راجہ اندر کے اکھاڑے کی پریاں تھیں، اور جب یہ پریاں جمع ہوتیں تو کئی چوہدریاں پار کر کے راجہ اندر اور ان کے درباری بھی پہنچ ہی جاتے۔ جناب رشیدالزماں خاں صاحب مرحوم کے بیٹے اور بیٹیوں نے جتنی حصاریں کھڑی کی تھیں ان کی اپنی اولاد نے سبھی پاٹ کر رکھ دیے تھے، سبھی حصاریں اور بندشیں ایک ساتھ ہی کھڑی کی تھیں۔ دور... بہت دور تک پھیلا ہوا یہ باغ دودھیا چاندنی میں جب نہایا ہوتا تو کسی درخت کی ڈالی پکڑے کوئی

خوبصورت حسینہ خود کو ہیروئن تصور کرتی۔ اپنے محبوب کی منتظر ہوئی یا دور کہیں ہنسی کی کھنکتی آواز سنائی دیتی یا دبی دبی سرگوشیاں اور چوڑیوں کے چھنکنے کی آواز آتی، کبھی کبھی سسکیاں، ناراضگی، جسم کے مختلف حصوں پر پھسلتی انگلیاں، سی سی کرتی بے خود مدہوش سی کانپتی ہوئی جوانیاں کہ یہ باغ گناہوں کا اڈہ تھا۔ جناب رشید الزماں خاں صاحب کے بڑے شوق سے لگوائے ہوئے درختوں کے پھل اپنا ذائقہ کھوئے جا رہے تھے اور ان کے بہت ہی سگے بہت ہی، اپنے خاندان والے سبھی حصاریں ایک ساتھ ہی پھلانگ گئے تھے۔ گئی رات تک یہ ہنگامے جاری رہتے اور دن چڑھے تک غنودگی کے عالم میں وہ سوتے رہتے۔ ساری ہستی ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی تھی وہ شہلا ہوتیں یا غزالہ، عارف ہوتے یا زاہد ان کے افعال و کردار ایک سے ہی تھے۔

آج بھی دھوپ منڈیروں پر چڑھ آئی تھی۔ اور وہ غنودگی کے عالم میں بستر پر دراز تھی کہ اچانک ہی ایک گرجدار آواز سن کر وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ گرجدار چیخ ضرور ہی اس کے ابو کی ہوگی اور یقیناً وہ اسی پر برہم ہوئے ہوں گے وجہ بھی وہ جانتی تھی کہ آج ناشتہ میں ضرور اماں بی نے گھی میں تر پراٹھوں کے بدلہ محض موری روٹی، بھجیا اور سوجی کا ابلا ابلا سا حلوہ بنا کر رکھ دیا ہوگا۔ ابو کو بچپن ہی سے تر پراٹھوں کی عادت تھی اور کلیجی یا قیمہ، شاہی ٹکڑے، فیرنی اور بالائی کے بغیر تو ناشتہ ادھورا ہی رہتا تھا۔ ادھر اماں بی تھیں کہ کل زر و زیورات لٹا کر بھی ابو کے لیے تر ناشتہ تیار نہ کر پاتیں۔

کاش میں نے رات ہی امی کو کچھ روپیہ دے دیا ہوتا۔ تاسف سے اس نے سوچا مگر رات اتنی دیر ہو گئی تھی جاوید کے پاس ہی۔ اور اس سے قبل تو اس کے پاس پیسہ ہی کہاں تھے؟ وہ بستر پر ہی چپکی پڑی رہی، کچھ دیر بعد جب اسے اندازہ ہو گیا کہ ابو دو چار برتن توڑ پھوڑ کر رخصت ہو گئے ہوں گے تو وہ الجھے الجھے بالوں کو برابر کرتی ہوئی ایک طویل انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دوپٹہ کے ایک کونے

میں بندھا ہوا روپیہ کھول کر اسے گننے لگی۔ دس دس کے چھ نوٹ تھے۔ "چلو ٹھیک ہے کچھ بھی سہی، فی الحال دوپہر کے کھانے میں کچھ تر نوالے ابو کے لیے فراہم ہو ہی جائیں گے" وہ بھاگی بھاگی گئی اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا تھا اس نے کچھ کہے سنے بغیر ہی روپیہ اماں کے ہاتھ میں تھما دیا اور ہمیشہ ہی کی طرح اماں شدید خواہش کے باوجود اس سے نہ پوچھ سکی کہ یہ روپیہ کہاں سے لائی ہو؟ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے نظروں سے کتراتی باورچی خانہ میں پھیلے ہوئے جھوٹے برتنوں کو سمیٹنے میں جٹ گئیں۔

"میرا ناشتہ کہاں ہے اماں؟" اس نے ماں کی طرف پشت کیے ہوئے ہی پوچھا۔

"نعمت خانہ میں رکھ دیا ہے نکال لو۔" ماں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اماں! میں تمہاری وہ نائلکس چکن والی ساڑی لے لوں؟ اس کا میکسی بنا لوں گی میرے سارے کپڑے چوپٹ ہو گئے ہیں، پھر اتنی موٹی ساڑی اچھی بھی تو نہیں لگتی تمہارے لیے کوئی دوسری ساڑی خرید لوں گی۔"

"لے لو مگر سنبھال کر کاٹنا۔"

"اوہ نہیں، میں ٹیلر سے سلواؤں گی فکر مت کرو۔"

....

"اماں میں کالج جا رہی ہوں، واپسی میں کچھ دیر ہو جائے گی شاید سات آٹھ بھی بج ہی جائے۔"

"اچھا"

"ابو پوچھیں تو کہہ دینا کہ کسی پروفیسر کے یہاں پڑھنے گئی ہے... نہیں ... نہیں کہہ دینا کالج میں کچھ فنکشن ہے۔"

"اچھا"

جناب رشید الزماں خاں صاحب مرحوم کی پوتی جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکلی، ڈیوڑھی کی دہلیز پر اس کا پرانا نمک خوار نوکر رمضو چاچا اپنے پوتے کو گود میں

لیے بیٹھا تھا اور ان کا کڑیل جوان بیٹا ڈنڈ پیل رہا تھا۔

وہ جلدی سے رکشہ پر بیٹھ گئی ویسے ہی اسے رمضو چاچا کی آواز سنائی دی۔

"ارے تو ایسے مرکھنے بیل کی طرح اینڈ تا نہ پھر کہ گھمنڈ بہت خراب چیز ہے۔ اور میں نے سُنا ہے کہ خدا والدین کے گناہوں کا بدلہ ان کی اولاد سے لیتا ہے۔

(پٹنہ سے نشر)

زرد موسم

ایک طوفان تھا جو گزر گیا۔ زندگی کاہے کو تھی طوفان ہی تھا اور اب وہ زرد پتے کی طرح ادھر ادھر ڈولتے ختم گئی تھی۔ ایک ایسا زرد پتہ جسے بہار کی آمد کا انتظار نہیں تھا۔ پھر بھی ہر لمحہ وہ دل کے قریب کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتی۔ کسی مسیحا کی بے دردی سے اٹھے اس قدم کا انتظار کرتی جس کا آئندہ قدم اس کے دل پر ہی پڑتا اور وہ سوکھے پتے کی چرمراتی برادہ بن کر اس عظیم دھرتی میں سما جاتی جہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس نے اپنے دل کے تمام دروازوں اور جھروکوں کو بند کر لیا تھا کہ کسی خواب کی یاد اُسے تباہ نہ کرے۔ لیکن دل تھا کہ بغاوت پر آمادہ تھا اور یادوں کی یلغار نے سارے محاصرے توڑ کر رکھ دیے تھے۔ پچیس سال گذر گئے ــــ ایک یگ بیت گیا۔ نہیں اس سے بھی زیادہ عرصہ بیت گیا۔ اس کی یادوں کا سلسلہ بہت دور سے آتا تھا۔ جب وہ محض دس بارہ سال کی بچی تھی، ایک رات اس کی ماں نے اپنے خوبصورت چمکتے لباس کو اتار کر سادی ساڑی پہن لی، اپنے پیروں سے بندھے گھونگرو کھول کر پھینک دیے اور قبل اس کے کہ اس کی اس کارروائی کو کوئی دیکھے عجلت سے اس کی انگلی پکڑ کر رنگ محل کے دروازے سے نکل بھاگی۔

اس رات کی ہیبت نے اُسے ہر ہر قدم پر ڈرایا تھا۔ اُسے کچھ بہت ٹھیک سے یاد بھی تو نہیں، بس اندھیری رات میں قدموں کی آہٹ اسے یاد تھی۔ اور وہ اپنی اور اپنی ماں کے قدموں کی آہٹ اسے یاد تھی اور وہ اپنی ماں کے قدموں کی آواز سے سہمی لرزتی، نہ جانے کدھر بھاگتی جارہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ کہاں تھمتی ؟ ۔۔ آج اپنی نصف زندگی گذارنے کے بعد بھی وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ لیکن ایک رات جب وہ سوکر جاگی تو ایک اجلی اجلی صبح تھی۔ ایک صاف ستھرے کمرے میں صاف بستر پر وہ سورہی تھی۔ اس کی ماں قریب ہی بیٹھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ پھر گھنٹی کی آواز سنی، لڑکیوں کے قدموں کی آہٹ اور ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سنیں۔ وہ ایک مشنری اسکول کا ہوسٹل تھا۔ پھر وہی اس کا گھر بن گیا۔ روز صبح وہ نیلا اسکرٹ اور جمپر پہنے، ہاتھوں میں کتابیں اٹھائے ہوسٹل کی سسٹرس اور اپنی ساتھیوں کے ساتھ اسکول جاتی پھر اس ہوسٹل میں واپس آتی۔ بجھی بجھی، کھوئی کھوئی خوفزدہ سی۔ اس کی ماں نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس چہار دیواری کی پناہ میں اُسے تنہا چھوڑ کر۔ کچھ دن بیت گئے پھر اچانک چند دنوں کے لیے اس کی ماں واپس آئیں اور چلی گئیں۔ اس کی ماں کی آنکھوں تلے گڈھے ہوگئے تھے۔ ملی دلی ساڑی پہنے کچھ پریشان سی تھیں لیکن اُسے دیکھ کر خوش ہوگئیں۔ پھر یہ ہمیشہ کا معمول ہوگیا۔ چار پانچ ماہ بعد وہ اچانک آجاتیں۔ ہوسٹل میں ٹھہرتیں اسکول کی سسٹرس کے ساتھ کاموں میں مدد دیتیں اور پھر چلی جاتیں۔ اس کا دل چاہتا اس کی ماں بھی ہمیشہ اس کے ساتھ وہیں رہ جائے۔ اسکول کی زمین اور کھڑکیوں کو صاف کرتی۔ پینٹری میں برتنوں کو پونچھ کر ٹیبل پر لگاتی، ہوسٹل کی اس چہار دیواری کے اندر اسے ایک تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن چند دنوں کے بعد اس کی ماں چلی جاتی اور وہ بہت ہمت کر کے بھی یہ نہیں پوچھ سکتی کہ ماں تم کہاں جاتی ہو ؟ کہاں رہتی اور کہاں سوتی ہو ؟ ماں کی پریشان حال صورت اس کے لبوں پر مہر لگادیتی اور وہ خاموش جلتی بجھتی آنکھوں سے اسے

رخصت ہوتے دیکھتی رہتی۔

اس کے اونچے کٹے بال دراز ہو گئے۔ اس کا قد ساڑھے تین فٹ سے بڑھ کر پانچ فٹ چار انچ ہو گیا۔ اس کے جسم کی لچک نے گلاب کی ڈالی کا رخ دھار لیا۔ لیکن اس کی مدھ ماتی ہرنی جیسی آنکھیں ہمیشہ کوئی خوفزدہ سی داستان سناتی معلوم ہوتیں۔

ایک دن اسکول کی مدر نے اپنے کمرے میں بلا بھیجا اور اپنے چہرے پر یسوع بھر کی سختی پیدا کرتے ہوئے کہا:۔

"نفیس! تم نے یسوع کی مہربانی سے ایم۔ اے پاس کر لیا۔ یسوع نے تم پر مہربانی کی ہے۔ اب ہم سب کی خواہش ہے کہ تم بھی یسوع کے لیے اپنے آپ کو تج دو۔ میری طرح تم بھی اپنا جیون یسوع کی شکشا کے لیے وقف کر دو کہ یہی ایک سچا راستہ ہے۔" اس نے بوکھلا کر مدر کی طرف دیکھا۔ مدر فیر باجواپنی بے پناہ نرم مسکراہٹ اور شگفتگی کے لیے مشہور تھیں ان کا چہرہ پتھر کی طرح سخت اور بے جان ہو رہا تھا۔ نفیس نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ مدر کی طرف دیکھ سکتی۔ قریب تھا کہ وہ اپنے دراز چمکیلے بالوں کو منڈوا کر سر پر وھیل رکھ لیتی کہ فیروز کی نظریں اسے اپنا طواف کرتی نظر آئیں۔

"آئینہ دیکھا ہے تم نے؟" اسے تنہا پاکر فیروز اچانک ہی شوخ ہو گیا۔

"نہیں کیوں؟ روز ہی دیکھتی ہوں۔" اس نے انجان بنتے ہوئے کہا، اور تیزی سے نکل جانا چاہا۔

"سنو نفیس! کیا تمہیں میری تصویر ان آنکھوں میں نظر نہیں آتی؟" اس نے آہستہ سے اس کی آنکھوں پر انگلی رکھ دی۔

"اف رستہ چھوڑو، مجھے جانا ہے۔" وہ ایک دم سے لمبے قدم اٹھاتی بھاگ گئی۔

شاید فیروز مجھے سہارا دے دے۔ شاید فیروز کے ساتھ میں زندگی گزاروں اسے لمبے بالوں سے کتنی محبت تھی۔ لیکن وہ تو ایک ایسی خوفزدہ ہستی تھی جس نے کبھی ان بالوں کے حسن کو دیکھا بھی نہیں۔

" فیروز مجھے تمہارا سہارا چاہیے۔ میں ہوسٹل چھوڑ دوں گی۔ ورنہ ...... ورنہ ...... "

" لیکن نفیس میں تو خود ابھی بے سہارا ہوں۔ والدین کے رہتے بے سہارا بھلا نوکری چاکری کے بغیر میں تمہارا سہارا کس طرح بن سکتا ہوں۔ "

نفیس کی آنکھوں میں آنسو تھم گئے۔ اور پھر نہیں برسے۔ جس دن وہ ہوسٹل کی چہار دیواری سے باہر آئی تھی، وہ درخت سے گرے پتے کی طرح لرز رہی تھی، خوفزدہ، حیران اور پریشان، اس عظیم الشان دنیا میں گناہ سے پناہ مانگتی جو کمزور لڑکی جو خود نہ جانے کس کے گناہ کا ثمر تھی۔ بارہ تیرہ سال کی ہیبتناک رات جب وہ اپنی ماں کی انگلی تھام کر رنگ محل سے بھاگی تھی، یہ دن بھی اس رات سے کم نہیں تھا۔ اسے ایک چہار دیواری کی ضرورت تھی جو اسے نصیب نہ تھی۔ لرزتے کانپتے اس نے اپنی ایک ہمدرد دوست کا سہارا لیا۔ چند دنوں اپنی ماں کے شامل وہ اس کے یہاں مہمان رہی۔ پھر وہاں کے آوٹ ہاؤس میں رہنے لگی۔ ادھر ادھر کے ٹیوشن اس کی زندگی کا سہارا بنے، پھر وہ انگریزی کے ایک مشہور اخبار کی بے باک اور نڈر جرنلسٹ بن گئی۔

کام اس کی پسند کا تھا۔ اس کے دن اچھے گذرنے لگے۔ لیکن اس کی نحوستوں نے اس کا ساتھ کب چھوڑا تھا۔ اس اخبار کا چیف ایڈیٹر اس پر دن بدن مہربان ہوتا گیا۔ اور وہ آوٹ ہاؤس کی ہی تنگ کوٹھری سے نکل کر گورنمنٹ کے بنے تین کمروں کے ایک فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔ اس بڑے شہر میں یہ تین کمروں کا فلیٹ اس کا اپنا تھا۔ جینے کی آرزو نے پھر آہستہ سے دل میں جھانکا، لیکن ایڈیٹر کی بڑھتی ہوئی مہربانیاں رنگ لائیں اور اس کے

ساتھ پریس میں کام کرنے والوں کی زبان پر اس کا نام ذرا بے تکلفی سے آنے لگا۔ پھر طنز اور حقارت کی ملی جلی چاشنی اس کا مقدر بن گئی۔ گھبرا کر اسے ریاض کا سہارا بنانا پڑا۔ وہ بھی تو اس کے ہمدردوں میں تھا لیکن وہ تالاب کی کائیاں جمی مچھلی کی طرح پھسل کر کہیں غائب ہوگیا۔

نفیس الجھتی رہی، اپنے آپ سے۔ اپنے احساسات اور خیالات سے کہ ایک دن اسی پریس سے شایع شدہ اخبار لے کر نفیس نے چیف ایڈیٹر کے سامنے پھیلا دیا اور آہستہ سے کہا:

"سر میں نے اس سروس کے لیے اپلائی کیا تھا۔" ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "انٹرویو ہونے ہی والا ہے۔ آپ ذرا سفارش کر دیجیے۔"

"بیٹی میں نے بھی تمہیں ابھی اسی لیے بلوایا تھا۔" سن رسیدہ ایڈیٹر کے چہرے پر کرب کی بہت ساری سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

پھر چھ سال پانچ ماہ تک لگاتار کام کرنے کے بعد نفیس نے وہ دفتر چھوڑ دیا، اور یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئی۔

کبھی کبھی کھوئی کھوئی سی، ادھورے سپنے دیکھتی۔ اداسیاں اس کا مقدر بن گئی تھیں کہ دبے قدموں راشد کے قدموں کی آہٹ اس کے دل کے قریب سنائی دی۔

"کیا لکھ رہی ہو نفیس؟" رشید بے تکلفی سے اس کے گھر پر آدھمکا۔

"کہانی لکھ رہی ہوں۔"

"کس کی کہانی لکھ رہی ہو؟"

"ایک بے سہارا لڑکی کی۔"

"کبھی ایک بے سہارا لڑکے کی بھی کہانی لکھ دو۔"

"لڑکے بے سہارا کب ہوتے ہیں؟"

"تو پھر وہ کیا ہوتے ہیں۔"

"وہ شاعر ہوتے ہیں۔"

"تو اسی شاعر کی کہانی لکھ دو۔"

"کہو تو دونوں کی کہانیاں ساتھ لکھ دوں۔" نفیس نے کشمکش کے عالم میں کہا۔

"ضرور لکھ دو۔ مجھے تو اسی دن کا انتظار تھا۔"

"اپنی زبان کا پاس رکھ سکو گے راشد۔" وہ جذباتی ہو گئی۔

"ضرور، ضرور، کیوں نہیں۔ بس تم اپنا خاندانی شجرہ مجھے دیدو، میں چند دنوں میں مما سے بات کروں گا۔ ڈونٹ نفیس! میری مما بہت ایڈوانس ہیں اور بہت اچھی ہیں۔ تم سے مل کر وہ یقیناً خوش ہوں گی۔" وہ روانی سے بول رہا تھا۔

"خاندانی شجرہ" وہ زیرِ لب بڑبڑائی اور خاندانی شجرہ کی گہرائی میں لڑھکتی چلی گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ پاش پاش ہو چکی تھی۔ عمر کی دبیز چادریں اس کے ذہن و دل پر تنی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم کراہ کراہ کر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کے خوبصورت دراز بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے تھے جسم کی لچک میں سختی آ گئی تھی۔ اس کے کنوارے پن کی بھینی بھینی خوشبو کسی کو مدہوش کیے بنا فضا میں تحلیل ہو کر گم ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں نے خواب دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ زندگی نے بڑا سخت امتحان لیا تھا اس سے۔

سستی سے بستر پر دراز اس نے آنکھیں کھولیں۔ نرم نرم دھوپ منڈیر پر سے اتر کر سامنے برآمدے کی سیڑھیوں تک آ گئی تھی۔ زرد گلاب کے پودے پھیل کر برآمدے کی سیڑھیوں تک جھک آئے تھے۔ اور وہ اپنے سفید بے داغ بستر پر لیٹی ان قدموں کی آہٹ کی منتظر تھی جس کا آئندہ قدم ٹھیک اس کے دل پر ہی پڑنے والا ہو اور وہ خشک پتے کی طرح چرمرا کر اس دھرتی کا انگ بن جائے جہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

(پٹنہ سے نشر)

آنچ

بات بہت چھوٹی سی تھی مگر بگڑ گئی اور جب سے شیبا مدھم سی لو دینے والے چراغ کی طرح دھیمے دھیمے جلے جا رہی تھی۔ شیبا چراغ تھی۔ روشنی تھی یا شعلہ — ؟ وہ جو بجلی تھی اور جیسے بجلی تھی مگر کوئی ایسی شئے یقیناً نہیں جو کسی کے دامن کو جلا دے، یا دل کے لطیف جذبوں کو جھلسا دے۔ اس کے دمکتے چہرے کی روشنی میں تو راستہ بھولنے والے راہ پا لیتے تھے مگر یہ کیا ہوا کہ بیٹھے بٹھائے وہ خود اپنا ہی راستہ بھول گئی۔ اور جب سے وہ جل رہی تھی۔ دھیمے دھیمے۔ آہستہ آہستہ۔

میں اس کے بچپن کی دوست رتنا ہوں۔ پانچ چھ سالوں بعد کئی سو میٹر لمبا راستہ طے کرتی اس عظیم الشان انسانی جنگل کلکتہ میں محض شیبا سے ملنے آگئی ہوں کہ وہ میرے بچپن کی دوست ہے۔

وہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی بس حیران نظروں سے تکے جا رہی ہے کہ ان دنوں خوشی بڑی انہونی سی چیز ہے اور خوش رہنے والے تو کچھ حوصلہ مند لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ شیبا اپنے بیٹے کے بچپن کو لیس سے سجا رہی ہے اور میں خود کو بڑا آؤٹ آف پلیس (OUT OF PLACE) محسوس کر رہی ہوں۔

مجھے اس کے چہرے پر کئی تحریریں ابھرتی نظر آئیں۔

" کتنے ہی دن بیت گئے ہیں رُتنا میں نے اپنے کسی دوست کا پیغام / حدیہ کہ کوئی گریٹنگ بھی نہیں پایا۔ "

" میں تو اپنی پچھلی زندگی سے ٹوٹ گئی ہوں کہ آج کے دور میں ٹوٹنا پھوٹنا بڑی عام سی بات ہے۔ "

میں حیرت سے اسے دیکھتی ہوں ۔ تو کیا شیبا کے بچپن سے کالج تک کا زمانہ، جو اپنی تمام خشر سامانیوں کے ساتھ ایک اچھی خاصی داستان تھا، محض ایک بھولی بسری کہانی بن گیا تھا۔

میں اس کے محل نما مکان اور قیمتی آرائشی فرنیچرس اور سیٹنگ کو دیکھتی ہوں پھر بھی مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ شیبا کا چہرہ پرسکون ہے۔ ایک لمحہ قبل والی تحریریں اس کے چہرے سے مٹ چکی ہیں۔ اور اب مسرّت کی کرنیں آہستہ آہستہ پھوٹ رہی ہیں۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی ہے۔ شاید اب اس نے مجھے پہچان لیا ہے لیکن مجھے بھولنے کا سوال ہی کیا کہ میں تو اس کے بچپن کی دوست رُتنا ہوں۔

شیبا نے ایک مڈل کلاس گھرانے میں جنم لیا۔ کالج کے ایک ٹیچر کے گھرانے میں۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا گھر آدرش اور کلچر کا مرکز تھا۔ ویسے بھی ٹیلنٹ مڈل کلاس والوں کا ہی حصہ ہے۔ شیبا کی ماں کلکتہ کی ایک اچھی ریڈیو سنگر تھیں۔ اور والد آر۔ کے بنرجی لکھنؤ میں انگریزی کے پرفیسر۔ خدا کی طرف سے شیبا ان دونوں کے لیے ایک ایسا تحفہ تھی جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ بچپن سے بی۔ اے تک کی تعلیم کے دوران شیبا کلاس میں کبھی سیکنڈ نہیں آئی ہمیشہ ٹاپ ہی کیا۔ اس پر غضب کی ملاحت لیے اس کا صندلی رنگ، خوبصورت کھلی آنکھیں، کتابی چہرہ اور سنہرے لانبے بال اکھرے جسم کی لانبی حسین لڑکی، جس کے چلنے کا ہر انداز گلاب کی ڈالی کی لچک یاد دلا دیتا۔

خدا ہر زمانہ میں شاید اس پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان رہا۔ بی۔ اے

کے ریزلٹ سے قبل ہی اس کی شادی کلکتہ کے ایک رئیس خاندان، یشودھرا رائے کے گھرانے میں ہوگئی۔ اس کی شادی میں شرکت کرنے والوں نے شیبا کی قسمت پر رشک کیا۔ کہ خوب رو مدھوکانت کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ شیبا زیادہ حسین ہے یا مدھوکانت۔ پھر یہ الیکٹریکل انجینئر ایچ۔ ایم۔ ٹی کے فرم میں اونچے عہدے پر فائز ساری اچھائیاں اکھٹے ہی مدھوکانت میں موجود تھیں۔

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد شیبا اپنے ماں باپ سے ملنے گھر آئی تو ایک لمبی سی چمکتی کار میں سفید وردی پوش ڈرائیور اسے لے کر آیا۔ شہر والوں نے شیبا کو اس ٹھاٹ باٹ سے شہر میں گھومتے دیکھا تو دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔

" خدا قسمت بنائے تو شیبا جیسی۔ " دل ہی دل میں دیکھنے والوں نے اپنی لڑکیوں کے لیے دعائیں مانگیں۔

اور شیبا۔ جب دوسری دفعہ گھر آئی تو دوستوں کے پاس بیٹھی اون سلائیاں لیے الجھتی رہی۔

" سومنا! تو مجھے جلدی پیٹنگ سکھا دے۔ مدھوکانت نے کہا ہے کہ اگر میں اسے سوئٹر بن کر نہ دوں گی تو وہ تمام جاڑا بن سوئٹر کے ہی گذار دے گا۔ اور اب جاڑا شروع ہونے میں زیادہ دن بھی تو نہیں۔ "

سدا خرید کر سوئٹر پہننے والی شیبا سنبھل سنبھل کر اون کے دھاگوں میں سلائیاں الجھاتی رہی کہ اس میں گرہیں نہ پڑ جائیں، کہیں دھاگہ ٹوٹ نہ جائے۔

" شیبا نے آنرز میں ٹاپ کیا، بنرجی! ایم، اے میں اس کا داخلہ کرادو۔ انگلش میں فرسٹ کلاس لانا کچھ آسان نہیں۔ غضب کی تیز بیٹی ہے تمہاری بھی اس کا کیریر برباد نہ کرنا۔ " اس کے بعد قریبی دوست ظفر صاحب مشورہ دیتے ہیں۔

" میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم اسے ایم۔ اے کر ہی لینا چاہیے۔ اب دیکھو مہمان اسے آنے دیں جب نا۔ وہ گھر کی اکیلی بہو ہے۔ رکھ رکھاؤ ذرا زیادہ ہی ہے۔ "

بنرجی کسی قدر ڈوبتی آواز میں کہتے۔ پھر شیبا ایک بھولی بسری کہانی بن گئی۔
گاہے گاہے بنرجی کے دوست اسکی خیریت دریافت کر لیتے تو وہ جھٹ دو چار رنگین تصویروں والا البم اپنے دوستوں کو بڑھا دیتے۔ " دیکھو یہ ساری تصویریں شیبا کی بیٹی رونو کی برتھ ڈے پارٹی کی ہیں۔ اور یہ البم اس کے چھوٹے بیٹے اجے کا ہے۔ اب تو وہ گھٹنوں کے بل دوڑنے بھی لگا ہے۔ اور اس البم میں ساری تصویریں کشمیر کی ہیں۔ اس دفعہ گرمی کی چھٹیاں ان دونوں نے کشمیر میں ہی گذاریں۔"
شیبا تصویروں میں منعکس تھی۔ طرح طرح کے رنگوں میں بھی۔
"شیبا کیا کر رہی ہو ان دنوں؟ آگے اس نے کچھ کورس لیا یا نہیں؟"
ظفر صاحب کو ان تصویروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں صرف اپنے کیریر کی فکر تھی۔
"یُو نو ظفر YOU KNOW ZAFAR مدھوکانت اپنے فیلڈ میں جینیس ہے۔ ابھی وہ تین ماہ کے لیے سوئزرلینڈ بھی جانے والا ہے۔" بینرجی مدھوکانت کے ہی گن گاتے جاتے۔ اور شیبا اپنے حسین اور خوبصورت بیڈ روم میں مارکٹ جانے کے لیے نہایت قیمتی ساڑی پہنے بڑے تکلف سے تیار ہوتے ہوتے سوچتی کہ۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر وہ اس وردی پوش ڈرائیور کی گاڑی پر ڈائرکشن دیتے ہوئے راستوں اور دوکانوں پر نہ جاکر کسی بس یا ٹرام میں ٹکتی جھکتی چڑھ جاتی۔ سادہ کاٹن کی ساری پہنے کھلے بالوں کا جوڑا باندھے اپنی پیشانی کو کم کم سے سجاکر جدھر جی چاہتا بھاگتی پھرتی۔ جس دوکان پر چاہتی رکتی یا چل دیتی اور لوگوں کی بھیڑ میں اس طرح شامل ہوجاتی کہ کوئی پیٹرا انہیں اچک نہ لے، اور نہ اسے اتنی ڈھیر ساری تکلیفیں برتنی پڑتیں کہ جن تکلفات کے غلاف میں اس کی اوریجنلٹی اس کی پرسنالٹی کب کی کھوچکی تھی۔
صبح سے شام تک وہ خود کو اپنے بچوں کے کپڑوں کی سلائی اور کڑھائی میں مصروف رکھتی کہ اب اسے زندگی گذارنے کا یہی ایک راستہ نظر آرہا تھا۔ وہ سارے کام جو اس نے شادی سے قبل کبھی نہ کیے تھے اب انہیں ذرا ڈھنگ سے کرنا سیکھ گئی تھی۔
میں رتنا سین۔ شیبا کی بنائی ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہوں۔

اس نے اپنی بیٹی کی فراک پر بڑے خوبصورت اسموکنگ بنائے ہیں۔ اس کے کمرے میں بچھا ہوا ٹیبل کلاتھ بھی اس کے آرٹسٹک ٹیسٹ کی گواہی دے رہا ہے۔ میں سوچتی ہوں وہ شاید پیدائشی آرٹسٹ ہے۔ جب ہی تو شیبا، جو اپنے ڈھیلے ڈھالے بلاوز کو اکثر اِدھر اُدھر سے سیفٹی پن لگا کر فٹ کر لیا کرتی تھی۔ اب خاصی سلیقہ مند ہو گئی ہے۔ میں اس کے بیڈ روم میں بیٹھی اس کے سلیقہ اور ہنر کی داد دے رہی ہوں۔

مگر اس کے چہرے پر کچھ تحریریں ابھر آئیں ہیں میں انہیں غور سے پڑھتی ہوں۔

"زندگی کی تمام بازیاں جیت لینے والے کبھی اپنا آپ بھی کھو دیتے ہیں۔"

"تم ہی کہو رتنا! جس نے اپنی آزادی کھو دی اس نے کیا پایا؟"

شیبا میری طرف کیک اور پیسٹری سے بھرا ہوا پلیٹ بڑھاتی ہے۔ میں اپنی باتوں کی دھن میں اس سے کہے جاتی ہوں...... وہ تو ونود کا ہی حوصلہ تھا کہ مجھ جیسی سخت سست کو بھی جرنلسٹ بنا دیا ورنہ تم تو جانتی ہو کہ میں بس مار باندھ کر ہی پڑھ لیا کرتی تھی۔ اور اب سوچتی ہوں کہ اگر ونود نے مجھے اس کام سے نہ لگایا ہوتا تو یہ بیکاروں کی زندگی میں کیسے گذارتی۔

ایک کانٹا اور چبھا۔ کئی طرح کی تحریریں اس کے چہرے پر گڈ مڈ ہو گئیں۔ میں اسکے ساتھ گھومتی اس کی لائبریری تک آ گئی ہوں۔ شیشوں کی الماریوں سے بھرے اس کمرے میں کتابیں ہی کتابیں ہیں۔" گڈ گاڈ! یہ تمہاری لائبریری تو بہت شاندار ہے۔ شیبا، ادھر کون سی کتابیں منگوائی ہیں تم نے؟"

شیبا نے گردن موڑ کر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو کو اپنی پلکوں میں ہی تھام لیا، اور دوسری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ یہ لائبریری میری نہیں مدھو کانت کی ہے۔ یہاں ہر سبجکٹ پر بہترین کتابیں تمہیں مل جائیں گی۔ سوائے لٹریچر کے، اس لیے کہ انہیں لٹریچر سے سخت نفرت ہے۔ کانت کا خیال ہے کہ لٹریچر بیوقوفوں کا موضوع ہے۔ جہاں صرف امیجنیشن اور آئیڈیلزم کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور تم ہی کہو رتنا آج کل کے پریکٹیکل زمانہ کو ان سے کیا واسطہ؟

میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی ہے۔ ایسا اطمینان جو کچھ خاص سی چیز پا لینے کے بعد ہوتا ہے۔ میں اندر سے ایک ذلیل سی خوشی بھی محسوس کر رہی ہوں کہ یہ انسانی فطرت ہے ورنہ شیبا کے سامنے تو ہر ایک کی پرسنالٹی محض بالشتئے سی ہو کر رہ جاتی ہے۔
اور اب ... اب تو وہ اپنا آپ ہی بھول گئی ہے۔

دوسرے دن میں شیبا سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی ہوں۔ لیکن شیبا جو خود کو بھول کر مدھوکانت میں زندہ تھی۔ اچانک ہی بیدار ہو گئی ہے اور اپنا راستہ کھو بیٹھی ہے۔

جب تیر کمان سے نکل جاتا ہے تو واپس نہیں ہوتا، اور جب نیم کش ہی رہ جائے تو غالب کا شعر بن جاتا ہے۔ سرفراز احمد خاں کی اپنی زندگی شاید کمان سے نکلا ہوا کوئی ایسا ہی تیر تھا اور نازش۔ غالب کا تیرِ نیم کش۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں نازش اپنے بیحد سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں نازش تھری۔ ان۔ ون اسٹریو پر انگلش میوزک کی دھن بجا رہی تھی۔ بہاما۔ بہاما۔ بہاما ماما کی ڈوبتی ابھرتی آواز۔۔۔۔ نعمان منشن کی دوسری منزل سے نیچے تک پھیل رہی تھی۔ ڈرائنگ روم سے لگے چمکتے کاٹھ کے زینے پر سرخ کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف آبنوسی کارنر ٹیبل پر پرانی وضع کا سیاہ ٹیبل پر نقاشی کیا ہوا لیمپ رکھا تھا۔ بڑے سے کیبنٹ میں رکھے ہوئے تھری ان ون کے پیچھے دیوار پر ایک بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی جس میں ہاتھیوں پر شکار کا منظر دکھایا گیا تھا۔ فائر پلیس سے لگے ہوئے مینٹل پیس پر پیتل کے کچھ پرانی وضع کے ایک ہی شکل کے برتن سجائے گئے تھے۔ ایک کونہ میں صندلی لکڑی کا بنا ایک بڑا سا قیمتی پرندہ اپنی چونچ پروں میں ڈالے آرام کر رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا صوفہ سیٹ اور فرنیچر بیحد پرانی وضع کا تھا۔ ڈرائنگ روم سے ملحق دروازے کے دروازہ میں سفید جالی کا پردہ

لٹک رہا تھا جس سے اندر کے بیڈ روم کی جھلک نمایاں تھی۔ یہاں بھی پرانی وضع کی تخت نما مسہری پر نفیس امریکی بیڈ کور بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف کونے میں اخروٹ کی لکڑی کے بنے ٹیبل پر بڑا سا آفتابہ رکھا تھا۔ دوسری طرف عمر خیام کی رباعیوں والی ہینڈل پر نقاشی کی ہوئی صراحی رکھی تھی۔ اس مکان کی ہر چیز اپنی گذشتہ تہذیب و روایات کی داستان کہتی معلوم ہوتی تھی۔ اور ڈرائنگ روم اور مکان کی سجاوٹ کی ترتیب اپنی روایت سے محبت کا احساس جگا رہی تھی۔ سوائے تھری۔ ان۔ ون کی بجتی ہوئی مغربی موسیقی کے جو برابر پاپ سانگ اور چا چا چا کی دھنیں اگل رہی تھی اور زندگی کا احساس جگا رہی تھی۔ بقیہ تمام اشیاء جامد تھیں، ساکت، بے حس و حرکت۔ ویسے بھی زندگی اور موت کے درمیان ایک قدم کا ہی فاصلہ ہے۔ جب حرکت رک جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے لیکن اس خوب صورت ڈرائنگ روم میں مغربی موسیقی کی دھنیں زندہ تھیں اور تمام اشیاء جامد و ساکت۔ مکان کے قریب کی مسجد سے مغرب کی آذان کی گونجتی ہوئی آواز بہاما کی موسیقی میں ڈوب کر رہ گئی۔ تھری۔ ان۔ ون کے پیچھے دیوار پر آویزاں پینٹنگ نے ڈرائنگ روم کی جامد اشیاء کو کنگھی ماری۔

مسلم علاقہ کے بیچ بازار میں واقع اس مکان کے اندر کا ماحول ذرا اجنبی سا تھا۔ تیسری منزل سے کاٹھ کے زینہ پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ تھکے قدموں کی آہٹ ڈرائنگ روم کے دروازہ تک آ کر رک گئی۔ نازش نے گھوم کر دیکھا۔ سرفراز احمد صاحب بہترین امریکن سوٹ پہنے ہاتھ میں چھڑی لیے کھڑے تھے۔

"میں کلب جا رہا ہوں نازش! تم کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا۔ نعیم کے ساتھ کھا لینا۔"

"او کے ڈیڈی۔" نازش نے لاپرواہی سے سر جھٹک کر کہا۔ سرفراز صاحب دوسری منزل سے آہستہ آہستہ نیچے اتر گئے۔ نازش کسی نئے ریکارڈ کے سلکشن میں زیادہ مصروف ہو گئی۔ اس کے بیحد سڈول جسم کی خوبصورتی بغیر دوپٹہ کے شلوار جمپر میں زیادہ ہی عریاں تھی۔ کاندھے تک کٹے بالوں میں ڈوبتے سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں، اور

اپنے اس توبہ شکن حسن سے بے خبر ریکارڈ سے الجھنے میں معروف تھی۔

کاٹھ کے زینہ پر آہستہ آہستہ پھر قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

" نازش ! " زینہ سے قریب ہی ڈرائنگ روم کے دروازے پر رک کر نعیم نے دھیرے سے پکارا۔

" اوہ ہائی ! ہاؤ سوئیٹ آر یو نعیم۔ میں اس وقت کتنی تنہا تھی اچھا کیا جو تم آگئے۔" نازش کے شبنم سے دھلے پھول جیسے چہرے پر اب تک تنہائی کی اکتاہٹ تھی

" میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں کل واپس جا رہا ہوں۔ " نعیم نے زینہ کے قریب سے ہی کہا۔ تبھی تھری۔ ان۔ ون کے نیچے دیوار پر ٹنگی پینٹنگ آہستہ آہستہ ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی۔

" لیکن کیوں ؟ ابھی تو تم آئے ہو۔ مجھے ڈیڈی نے بتایا تھا کہ کم از کم ایک ماہ یہاں ٹھہرو گے۔ "

" لیکن میں اتنے دنوں تک کیسے ٹھہر سکتا ہوں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں میں جہاں پوسٹیڈ ہوں، وہاں دور دور تک دوسرا کوئی ڈاکٹر نہیں۔ میں اتنے زیادہ لوگوں کو بے سہارا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ "

" نعیم ! یو آر سو سمپل۔ تم اپنے قصبہ کو چھوڑ کر یہاں آجاؤ نا۔ وہاں کیوں اپنی زندگی برباد کرتے ہو۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ تم بڑے ذہین ڈاکٹر ہو۔ یہاں تمہاری پریکٹس خوب جمے گی۔ بہترین کار خریدو گے۔ اپنا بنگلہ ہوگا، آرام کی چیزیں ہوں گی۔ یہ کیا کہ کسی قصبہ میں زندگی گذار رہے ہو۔ "

نعیم مسکرا کر رہ گیا۔ نازش کے کسی سوال کا جواب اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ دونوں کے خیالات میں زمین و آسمان کی وسعت حائل تھی۔

تھری۔ ان۔ ون پر بہاما کی گونجتی موسیقی خاموش ہو گئی تھی۔ اور اب ڈیسکو ڈیسکو کی آواز گونج رہی تھی۔ بیڈ روم میں رکھے آفتابہ کی آنکھ سے آنسو کے موٹے موٹے قطرے گر رہے تھے۔

"خاموش کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں؟"

"کہہ تو رہا ہوں کہ کل چلا جاؤں گا۔ مجھے بہت کام ہے اور وقت بہت مختصر۔"

"کتنا مختصر وقت ہے تمہارا؟" نازش نے اپنے بالوں کو جھٹکتے ہوتے تمسخر سے پوچھا۔

"اتنا ہی جتنا آذان اور نماز کے درمیان کا وقفہ۔" نعیم نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔"

"تو کیا تم بچپن کی منگنی توڑ جاؤ گے۔" نازش نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میں تمہاری زندگی سے کھیلنا نہیں چاہتا، اور اپنی زندگی بھی برباد کرنا نہیں چاہتا۔ قبل اس کے کہ کوئی تیر نیم کش میرے دل میں دائمی کسک پیدا کردے، میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ یہ رشتہ تو میری امی اور تمہارے ابو نے طے کیا تھا اور یہ ان کی عظمت ہے آج پندرہ سالوں بعد بھی انہیں اپنی بات یاد ہے۔"

ہمیشہ چپ چپ رہنے والا نعیم آج بیحد بولڈ ہو رہا تھا۔ نازش چپ چاپ اسے تکتی رہی۔ یہ کیسا عجب انسان ہے اور دقیانوسی بھی اور یہی اس کا منگیتر ہے۔ اپنے ڈیڈی کی عقل پہ وہ حیران تھی اور اسے غصہ بھی آرہا تھا۔ انہوں نے نعیم کی ایسی لمبی چوڑی تعریف کی تھی کہ اپنے خیالوں میں اسے وہ نہ جانے کیا کیا سمجھ بیٹھی تھی۔ اور یہ تو نکلا محض ڈھول کا پول۔

نازش کا چہرہ جذبات کے اتار چڑھاؤ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور نعیم اس حسن مجسم کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسکی والدہ نے بھی تو اپنی چہیتی بھانجی کی ایسی پیکر تراشی کی تھی اور ایسے ایسے کارنامے سنائے تھے کہ بچپن ہی سے نازش کو اس نے اپنے تصورات میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رکھا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے بچپن ہی میں سات سمندر پار والے دیش میں جا بسی تھی۔

تھرکی۔ ان۔ ون پر گونجتی ہوئی موسیقی خاموش ہو گئی۔ تیتی صندلی پرندہ نے چونک

کر اپنی چونچ پروں سے نکالا۔ اور چاروں طرف گمبھیر خاموشی سے ڈر کر اپنے پر پھڑپھڑانے لگا۔

وقت ڈوبتا گیا۔ آہستہ آہستہ نعیم کی تیز نظریں گرد و اطراف کا جائزہ لیتے لیتے تھک گئی تھیں۔ قدیم روایات و تہذیب کے نمونے، آرٹ و کلچر کی تمام چیزیں کمرے میں ایسے ہی مدفون تھیں۔ جیسے مصریوں کو ان کے رشتہ داروں کی ممی عزیز ہوا کرتی تھیں۔ ساری چیزیں مردہ تھیں، بے جان ساکت و جامد زندگی صرف تھرکی ان۔ وہ دن میں تھی جو اذان کی گونجتی آواز کو نگل لیتی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ نعیم بھی ڈوبتا گیا۔ آہستہ آہستہ رات بھیگتی گئی۔ پھر بیت گئی۔

صبح ڈائننگ ٹیبل پر نازش دمک رہی تھی۔ نکھری ہوئی تازہ، شاداب نازش اسے تنہا دیکھ کر سرفراز احمد صاحب نے پوچھا۔

”نعیم کہاں ہیں؟ تم تنہا کیوں ہو؟“

”ڈیڈی، وہ تو آج صبح ہی گاؤں چلا گیا۔ کل کہہ رہا تھا میں صبح پانچ بجے چلا جاؤں گا۔ اس نے آپ کو سلام بھی کہا ہے۔ ڈیڈی، وہ بہت بڑا جانور تھا بہت بڑا۔“

راجا

نام تو اس کا رضیہ تھا مگر وہ رضیہ سے رجّو بنی اور پھر راجہ بن گئی۔ اس کے نام کی یہ خصوصیت ایسی ہی تھی جیسے کسی نئی نویلی دلہن کی گود میں جب اس کا بچہ آجائے تو پورے نو ماہ کی ریاضت اور تصورات کی دنیا پر کہا سا منڈلا جائے۔ اور گورے گلابی رنگ کے ہمکتے بچہ کے بدلے کولتار کے رنگوں جیسا کوئی کیڑا اس کی گود میں سرسرانے لگے اور وہ نئی نویلی ماں قدرت کی اس ستم ظریفی پر کڑھ کر اور اپنے دل سے مجبور ہو کر اسے چندا یا حسینہ جیسے نام سے پکارنے لگے تو واقعی اس کے لیے وہ چندا یا حسینہ سے کم نہیں، تو راجا کا وجود بھی اپنے گھر میں ایسا ہی تھا۔ ادھر رضیہ نے جنم لیا، اُدھر اس کا باپ بیمار پڑا۔ وہ رضیہ سے رجّو بنی تو اس کا باپ نورالدین اللہ کو پیارا ہوا۔ اور جب وہ راجہ کہہ کر پکاری جانے لگی تو غربت اور افلاس کی اُمڈی گھٹائیں اسکو اپنے بازوؤں میں سمیٹ چکی تھیں۔ اس کی دو بڑی بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ راجہ کی ماں خاصی دور اندیش عورت تھی۔ وہ جب بیاہ کر آئی اسی وقت اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ حویلی کھنڈرات میں بدلنے والی ہے اور یہ ظاہری رکھ رکھاؤ ہے، سطحی ہے، کھوکھلا ہے۔ آخر وہی ہوا۔

غربت کا سایہ منڈلانے لگا۔ نورالدین بھی اللہ کے گھر سدھارے۔ کچھ نزدیک کے رشتہ داروں نے کھڑے ہوکر راجہ کی بے حد کمسن بہنوں کی نسبت طے کر کے شادیاں کرادیں۔ گھر کا سارا اثاثہ اور چھوٹا سا کھیت جو نورالدین کا ذریعہ معاش تھا، ان شادیوں کی نذر ہوا۔ پھر بھی بیوہ ماں نے اپنے اللہ کا اور اللہ کے بعد اپنے سسرالی رشتہ داروں کا شکریہ ادا کیا کہ کم از کم اس کی دو بچیاں سسرال والی ہوگئیں اور اب انہیں کھانے کپڑے کی تکلیف تو نہ ہوگی۔ دونوں کے شوہر بہرحال کماؤ تھے اور چار پیسے کی نوکری بھی کر رہے تھے۔ رہی راجہ تو اسکی قسمت اوپر والے کے ہاتھ تھی۔

راجہ جوان ہوتی گئی، مفلسی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ مجبور ہوکر اس کی ماں اپنے رشتہ داروں کے یہاں برتن مانجھنے اور کھانا پکانے کے کام سے لگ گئی۔ کبھی وہ کسی کا پانی بھر دیتی، کبھی کسی کے یہاں تقریب ہوتی تو وہاں ہاتھ بٹانے چلی جاتی۔ اپنی ماں کے ساتھ ساتھ راجہ بھی ماں کا زیادہ سے زیادہ دکھ بانٹ لیتی۔ پھر بھی اسکے حصے میں جھڑکیاں ہی آتیں۔ اس کی وجہ کچھ تو اسکی بے زبانی تھی اور کچھ اسکی ہرنیوں جیسی بڑی بڑی آنکھیں جو ہر وقت چوندھیائی، گھبرائی سی سوالیہ نشان بنی رہتیں۔

راجہ میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ وہ کسی کو خوبصورت نظر آتی۔ سانولا سا چہرہ تھا، لانبا، دبلا پتلا جسم، موٹے موٹے ہونٹ، معمولی سی ناک مگر بیحد خوبصورت آنکھیں۔ چہرے سے ٹپکتا ہوا بھولا پن۔ اسکے چہرے میں کوئی خاصیت نہ تھی سوائے اس کی آنکھوں کے۔ اس کی خالائیں اور پھوپھیاں ڈرا کرتی تھیں کہ ان کے جوان ہوتے ہوئے رنگین مزاج بیٹے ان آنکھوں کے سحر میں گرفتار نہ ہوجائیں۔ کچھ اس کی حسرت بھی رہی جاتی کہ ان کی نازوں کی پالی بیٹیاں چاہے جتنے موٹے موٹے کاجل کی لکیریں آنکھوں میں کھینچ ڈالیں مگر راجہ کی کاجل سے بے نیاز جھالر جیسی پلکوں کی ایک جھپک ہی وہ جادو جگاتی تھی جو ان کی بیٹیاں کبھی نہ جگا پاتیں۔ ادھر اچھی خالہ اور ننو پھوپھی کے بیٹوں میں ایک مقابلہ سا چل نکلا تھا اور ہر گھڑی ہی ان لوگوں کو نت نئے کام راجہ سے رہنے لگے تھے۔

کبھی راشد کو چائے کی شدید خواہش ستانے لگتی تو وہ کبھی نیر کی قمیض کے بٹن بے وقت ہی ٹوٹ جاتے۔ کبھی اس کے دوست شام کی چائے پر مدعو ہوتے تو کبھی راشد کے کپڑے کی دھلائی اشد ضروری ہو جاتی۔ ان کی اپنی مائیں تو تمام دن خانہ داری ہی میں تھکی جاتی تھیں۔ اور بہنیں تو بھائیوں کے یہ چونچلے سہنے سے رہیں۔ لے دے کے رہ جاتی تھی تو ایک راجہ کہ وہ سدھائے جانوروں کی طرح کام کے درمیان بھٹکتی رہتی اور نظر میں ایک ہی سوال دہرائے جاتی کہ کیا وہ صرف ان کاموں کے لیے ہی بنی ہے؟

راجہ کی ماں خاندانی شریف اور خوددار عورت تھیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے آئے دن کے تماشے دیکھتیں اور نہ سمجھ پاتیں کہ آخر وہ کریں تو کیا کریں۔ اچھی خالہ اور ننو پھوپھی کے لڑکوں کو اگر واقعی چاہت تھی کوئی بڑھ کر اس کا ہاتھ کیوں نہیں تھامتا۔ شریف ہوتے تو ایک رشتہ دار غریب سے نکاح کیوں نہیں پڑھا لیتے۔ راجا آخر تو ان کے خاندان ہی کی تھی یا اچھی خالہ اور ننو پھوپھو ہی اپنی غریب بھانجی کو بیاہ لے جاتیں کہ یہ کار خیر تھا۔ راجا کی ماں سب دیکھ سمجھ کر بھی چپ تھیں کہ شاید کبھی انہونی 'ہونی' ہو جائے اور خدا کوئی نیکی ان رشتہ داروں کے دل میں ڈال ہی دے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہوا۔ اچھی خالہ اور ننو پھوپھو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے کشیدہ ہی رہتی تھیں۔ بے حد گٹھ جوڑ کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کی بڑی مداح بن گئیں۔ پھر دونوں نے مل ملا کر اچانک ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ راجا کے لچھن انہیں اچھے نظر نہیں آتے۔ وہ ہر گھڑی ان کے بیٹوں کے آگے پیچھے پھرا کرتی ہے۔ لونڈیا کے چال چلن درست نہیں۔ کہیں سے کوئی لڑکا ڈھونڈ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دو ورنہ ایک سڑی مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ آخر ہماری بھی بیٹیاں ہیں کہیں انہیں بھی سیکھ سکھا دیا تو خاندان کی کیسی بدنامی ہو گی۔

راجا کی ماں کلیجہ تھام کر سنتی رہیں اور راجا کو کوستی رہیں۔

"راجا خدا چاہے تو اتنی دور بیاہی جائے کہ پھر تیری صورت نظر نہ آئے۔ ہائے راجا تو نے اپنے مرے باپ کی عزت کا بھی خیال نہیں کیا جو بوڑھے کاندھے پر ہل لاد کر لے جاتا اور چار پیسہ عزت کی کمائی کرتا تھا۔

راجا اپنی جھاڑ کی آنکھوں کو چھپاک جھپاک کرتی اپنی کھنڈر نما کوٹھری میں گھس جاتی اور سوچتی، میں نے کیا کیا — ؟ کچھ بھی تو نہیں۔ مجھے جس کام پر جس نے لگا دیا سو کرتی رہی۔

نمو پھوپھو کے یہاں تقریب تھی۔ ان کی بیٹی شہلا کو لوگ دیکھنے اور منگنی کرنے آرہے تھے۔ بمبئی سے لوگ آنے والے تھے۔ چار دن قبل سے ہی پکوان پک رہے تھے۔ طرح طرح کی خشک چیزیں تیار کر کے اسٹور میں رکھی جارہی تھیں۔ بہار شریف جیسے چھوٹے سے شہر میں بمبئی سے لوگ آنے والے تھے، وہ بھی رئیس و کبیر، بہت بڑے تجارت پیشہ۔ وہ تو نمو پھوپھی کا ہی کرشمہ تھا جو انہوں نے جانے کیسے کیسے پانسے پھینکے کہ یہ بمبئی والے اپنے بیٹا کا رشتہ نمو پھوپھی کی بیٹی سے کرنے کو تیار ہو گئے۔ نمو پھوپھو کی بیٹی شہلا بھی اچھی خاصی تھی۔ گورا چٹا رنگ، لمبے گھنے بال، بھرے بھرے چہرے والی کھاتے پیتے گھرانے کی تندرست لڑکی تھی اور بی، اے پاس۔ کام کاج میں سگھڑ۔ ہر گن موجود تھا سوائے اس کے کہ اس کی کسی سے بنتی نہ تھی۔ اور خود کو وہ سبھوں سے برتر سمجھتی تھی۔ مگر یہ بات کون جانتا۔ راجا اسکی قسمت پر رشک کرتی۔ کتنی اچھی قسمت لے کر آئی ہے یہ شہلا بھی۔ ایک وہ تھی کہ ہر گھڑی سبھوں کی جھڑکیاں ہی سنتی۔ شہلا اور اچھی خالہ کی بیٹیاں تو بس بیٹھی بیٹھی ٹیبل کلاتھ پر پھول کاڑھے جاتیں اور گھر کے سارے بھاری کام اس کے سر پڑ جاتے، پھر بھی گن انہیں کے گائے جاتے۔ اور جب سے اچھی خالہ اور نمو پھوپھو کے گٹھ جوڑ نے شور شرابے مچائے تھے، راجا کی زندگی ہی اجیرن ہو گئی تھی۔ بھری دنیا میں اب ماں ہی تو اس کی ہمدرد تھیں، سو وہ بھی ایسی ناراض ہوئیں کہ بیٹھے بٹھائے کوسے جاتیں۔

"ہائے راجا، تجھے تو اتنی دور بیاہوں کہ تیری صورت نظر نہ آئے۔"

بہر حال اس تقریب کا زیادہ سے زیادہ کام راجا اور اس کی ماں کو ہی کرنا تھا۔ نمک پارے، بادام کی قتلی، چنے اور گاجر کا حلوہ سبھی تیار تھا۔ بس مہمانوں کے پہونچنے کی دیر تھی۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا کہ لڑکے کی ماں اور بیٹیاں ٹیکسی میں بھر کر حویلی پہونچی۔

راجا کی ماں صبح ہی سے شاہی ٹکڑے، باقرخانی، قورمہ، شامی کباب، نرگسی کباب اور یخنی پکانے میں مصروف تھیں۔ راجا ماں کے ساتھ بیٹھی تھی کہ اچانک ممو پھوپھو کی نظر اس کے گندے میلے کپڑوں سے الجھ گئی۔

"ہے ہے۔ اس راجا کی بچی نے اسقدر غلیظ کپڑے پہن رکھے ہیں اور سبھوں کے بیچ ممو پھوپھو، ممو پھوپھو کی رٹ لگائے گی۔"

ممو پھوپھو نے شہیلہ کی چھوٹی بہن رابعہ کو آواز دی۔

"دیکھو ربّو، گھر میں مہمان بھرے ہیں اور راجا ویسے ہی غلیظ کپڑے پہنے گھوم رہی ہے۔ تم شہیلہ کا کوئی معمولی سا جوڑا نکال کر اسے دیدو۔ خدا چاہے گا تو شہیلہ اب نئے کپڑوں سے لد جائے گی۔ پھر وہ منہ میں کچھ حساب کتاب بٹھاتی چل دیں۔ رابعہ ماں کی بات سنکر خوش ہو گئی۔ راجا سے اسکی خاصی دوستی تھی اور اسی دوستی کے ناتے اسے کتنی بار ماں سے ڈانٹ بھی سننی پڑی تھی۔ اس لیے کہ وہ اکثر اچھا جوڑا راجا کی نذر کر دیتی۔ اور جب اس کی اماں بی اچھا بھلا کپڑا راجا کو پہنے دیکھتیں تو برا بھلا کہتی تھیں۔ رابعہ دوڑی دوڑی گئی اور ایک زرد ٹیفنا کی شلوار، جمپر راجا کے لیے نکال لائی۔ سوٹ خاصا پرانا تھا اور جگہ جگہ سے مسک رہا تھا۔ پھر بھی شوخ، لہلہاتا رنگ ویسے ہی تھا۔ دوپٹہ بھی ٹھیک تھا۔ راجا نے اسے پہنا تو اس کا دل چاہا کہ وہ ایک بار آئینہ دیکھ لے کہ آخر وہ ان صاف ستھرے کپڑوں میں کیسی لگتی ہے۔ وہ بھاگی بھاگی گئی اور چوری چوری سنگھار میز کے آئینے کو تکنے لگی۔ ویسے ہی کسی کام سے اچھی خالہ ادھر نکل آئیں اور راجا کو آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر جل گئیں۔ اس کے کھلے ہوئے رنگ و روپ کو دیکھ کر بھی کڑھ گئیں۔

"کمبخت! بھاگ یہاں سے۔ تو یہاں کیا کرنے آ گئی۔ ابھی یہاں راشد اور نیر آجائیں گے تو کیا کہیں گے۔ تجھے ذرا نہ اپنا خیال ہے، نہ خاندان والوں کی عزت کا۔"

پھر وہ بھاگی بھاگی گئیں اور ہزاروں سینکڑوں کاموں میں پھنسی ممو پھوپھو کے کان میں پھس پھس کرنے لگیں۔ ممو پھوپھو نے گھور کر راجا کو دیکھا، پھر نہایت کرخت آواز میں بولیں "اسی لیے تو کمبخت کو کچھ لینے دینے کا دل نہیں چاہتا۔ ورنہ کیا تھا جہاں تین لڑکیوں

کو پوس پال ڈالا وہاں ایک یہ بھی رہتی لیکن اس کا تو حال ہی یہی ہے کہ جس برتن میں کھاؤ وہیں چھید کرو۔"

راجا چور اور گنہگار کی طرح گرتی پڑتی بھاگی تو شربت کی ٹرے اٹھا کر مہمان خانے میں ہی گھستی چلی گئی اور سبھوں کو بڑھ بڑھ کر شربت اور ناشتہ دیتی رہی۔ لڑکے کی بہنوں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

"ہے۔ کیا ہی خوب صورت آنکھیں ہیں اسکی۔"

"بے حد"

"نازک کتنی ہے؟"

"بے شک"

"کون ہے یہ؟"

"پتہ نہیں"

سرگوشیاں بڑھتی رہیں، ضیافتیں ہوتی رہیں۔ رات کے پر تکلف کھانے کے بعد لڑکے کی ماں نے راجا کو جھوٹے کی برتن اٹھاتے وقت جا لیا۔

"اے بیٹی، تمہارا نام کیا ہے؟"

"راجا" اس نے بے تعلقی سے جواب دیا۔

"تمہارے ابّو کا کیا نام ہے؟"

"جی وہ مر گئے۔" وہ پھوہڑپن سے بولی۔

"تمہاری اماں جی کہاں ہیں؟"

"باورچی خانہ میں کھانا پکا رہی ہیں۔"

"شہیلہ کی اماں تمہاری کون ہیں؟"

"پھوپھو"

کھانے کے بعد اور سونے سے قبل لڑکے کی اماں نے ننو پھوپھو کو بلا کر بڑی شفقت سے پاس بٹھایا اور بولیں۔

"بہن! مجھے تو آپ سے کچھ مانگنا ہے۔ آج میں اپنے بیٹے کے لیے راجا کا رشتہ لوں گی۔ بات ایک ہی ہے، رشتہ چاہے بیٹی کا ہو یا بھتیجی کا۔ دونوں ایک ہی گھر کی لڑکیاں ہیں۔"

نوپھوپھو کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

آخر رنگ لائی یہ راجا کی بچی۔ دل ہی دل میں انھوں نے ہزاروں کوسنے دے ڈالے۔

"اوئی نوج! راجا اس خاندان کی کیوں ہونے لگی۔ وہ تو ڈروس کی ایک غریب عورت کی بیٹی ہے جو ہم لوگوں کے یہاں کام کرتی ہے۔ محلہ کی عورت ہے۔ اس لیے سبھوں کو پھوپھو، خالہ کہہ کر پکارتی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا بہن! اگر کسی غریب لڑکی کی قسمت سنور جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ اس کی اماں کو بلوا دیجیے تو میں سبھوں کے سامنے راجا کو انگوٹھی پہنا کر بات پختہ کروں اور مہینہ عشرہ میں بیاہ لے جاؤں۔"

نوپھوپھو ہائے وائے کرتی ہی رہیں۔ راجا کی بارات انہیں کے دروازے آ لگی۔ کمبخت راجا نے کیسے کیسے مونگ دلے تھے سینے پر۔ باراتی بہت ہی مختصر آئے اور دولہا سیدھے ہیلی کوپٹر سے آیا۔ گیارہ جوڑے جھل جھل کرتے کپڑے ایسے کہ اس جگہ کے لوگوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ موتی اور نگینے جڑی ساڑیاں، سونے چاندی کے زیور، عطردان۔ ایسا ڈالا تو شاید یہاں آیا ہی نہ تھا۔

عورتیں دنگ تھیں۔ راجا کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں کہ ڈالے کی دو ساڑیاں چوری ہو گئیں۔ نگینے اور موتی جڑی ساڑیاں کسی نے اڑا لی تھیں۔ رخصتی کا وقت تھا۔

راجا رو رو کر ماں سے کہہ رہی تھی۔

"اماں تم کہتی تھیں، تجھے ایسی جگہ بیاہوں گی کہ پھر تیری صورت نہ دیکھوں۔

تو تم نے سچ کر دکھایا۔"
راجا کی ساس کہہ رہی تھی۔
"شاید یہ تیرے نام کا کرشمہ تھا بیٹی! کہ تو واقعی راجا ہی بن کر رہے گی اور
اپنی اماں جی سے ضرور ملنے آئے گی۔"
راجا روتی دھوتی رخصت ہو گئی۔
کچھ دنوں بعد اس نے اپنی ماں کو بھی بلا لیا اور ننھو کیھو، اچھی خالہ اور پڑوس
میں صرف راجا کی کہانی باقی رہ گئی اور دو نگینے جڑی جھل مل کرتی ساڑیاں۔

ہارٹ اٹیک

ایک دم جیسے صولت کی سانس رک گئی۔ عمر قید کی سزا اُسے ہی بھگتنی تھی؟ سسرال کیا تھی اچھا خاصا جیل خانہ تھا۔ یہاں زندگی کسی طرح کاٹ جا رہی تھی۔ لق و دق حویلی تھی۔ اس کے بڑے بڑے آنگن، طویل برآمدے، ہال نما بڑے ڈھکے کمرے جن کی دیواروں پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے۔ اُونچی اونچی چاول کی کوٹھیاں جن میں منوں من اناج تھے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے حصار کے اندر نوکروں، چھوکریوں، جٹھانیوں، دیوروں اور نندوں کی ایک پوری فوج آباد تھی۔ صولت کی زندگی یہاں کے دن رات کے تانے بانے میں کچھ عجیب طرح سے الجھ کر رہ گئی تھی۔ چار بجے صبح سے ہی طرح طرح کی آوازیں کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ برتنوں کی ڈھنڈھناہٹ، کوئلہ توڑنے کی آواز اور نوکروں کی بھاگ دوڑ۔ کمبخت گھر تھا یا کباڑیے کی دوکان۔ ذرا صبح کا اجالا پھیلتا تو گھر والے کاندھوں پر تولیہ ڈالے منہ میں برش دبائے غسل خانہ کا رخ کرتے۔ ہر ایک کو عجلت پڑی ہوتی۔ مگر اتنے بڑے خاندان کے لیے ایک غسل خانہ سخت ناکافی ہوتا، اور بس اسٹینڈ کی کیو آپ سے آپ ہی بن جاتی۔ باورچی خانہ میں ڈھیروں

آٹا گوندھا جاتا۔ سبزیوں کے چھلکے، بیچ انگنائی میں بڑی لاپروائی سے پھینک دیئے جاتے۔ بک چڑھے دیوروں کے لیے گھی میں پراٹھے تلتے۔ انڈے کا آملیٹ تیار ہوتا۔ کچھ حلوے بنائے جاتے۔ خدمت گذار نندیں اکثر سادی چپاتی اور آلو کی بھاجی پر ہی اکتفا کر لیتیں۔

صولت چپکے چپکے جائزہ لیتی۔ صبح آٹھ بجے سے ساڑھے دس بجے دن تک ناشتہ کھانے کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے چھوٹے دیور سیٹی بجاتے کندھا اچکاتے اپنی اپنی سائیکلوں پر اسکول اور کالج روانہ ہو جاتے۔ خسر صاحب اپنی پرانی اچکن پہ کورٹ سدھارتے۔ سجاد اپنی درجنوں بھر اسٹوڈنٹس سے گھرا انہیں نوٹ پر نوٹ لکھائے جاتا اور ہر دس منٹ بعد وقفہ سے گھڑی دیکھتا جاتا کہ کلاس کا وقت ہی نہ نکل جائے۔ گھر سے مردوں کے جانے کے بعد بڑی بھابھی کا موڈ ہمیشہ خراب ہی رہتا۔ کبھی صبح ہی صبح بھائی سے نوک جھونک ہو جاتی اور وہ ناشتہ کیے بنا ہی آفس چل دیتے۔ کبھی کسی چھوٹے بچے کو خواہ مخواہ کی ضد سوار ہو جاتی اور اس کی خاصی ٹھکائی ہوتی۔ ساس اماں دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے کے بعد جھوم جھوم کر قرآن شریف تلاوت کرتیں۔ نندیں اپنے کمرے میں اونگھتی رہتیں یا کشیدہ کاڑھنے بیٹھ جاتیں۔ چار بجے شام سے پھر ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ وہی ناشتہ، چائے اور کھانے کا طویل سلسلہ۔ صبح سے شام تک ایسے پھیکے ماحول میں صولت کا کلیجہ کٹتا رہتا۔

اکثر محلہ کی عورتیں اس دور دراز کی بہو کو دیکھنے آتیں۔ سر سے پیر تک گندے سے کالے اجلے برقعے میں لپٹی لپٹائی، طوطے کی طرح دیدے گھما گھما کر اُسے دیکھتیں۔ اس کے رنگ روپ اور کپڑوں سے یکلخت مرعوب ہو جاتیں اور چڑھ کر پوچھتیں۔

"باوا کیا کام کرتا ہے۔"

"کتنی بہنا ہیں آپ؟"

"ا وئی ناک میں کیل نہ میسر۔ ای کون ڈھنگ چھیئے ہو کا؟"

ان کی باتیں سُن کر صولت کو اختلاج کا دورہ پڑنے لگتا۔ وہ ٹک ٹک ان کا منہ تکا کرتی۔ اس کی نندوں پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا۔ کبھی کوئی مارے ہمدردی کے چپکے سے اس کے کان میں کہہ جاتا۔

"بھابھی بڑی خطرناک عورتیں آ رہی ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ سوتی بن جایئے۔" وہ جلدی سے ادھورا پڑھا ہوا ناول اپنے سرہانے چھپا منہ پر دوپٹہ ڈال کر سو ہی جاتی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ خود کو اس ماحول میں کیسے کھپائے اس کا اپنا وجود یہاں محض بیکار سا ہو کر رہ گیا تھا۔ صبح سے شام تک وہ کسی طرح وقت گذارا کرتی۔ ڈھلتی ہوئی شام کے ملگجے اندھیرے میں سجاد کے اسکوٹر کی آواز سنائی دیتی۔ سجاد ٹینس کا بلا لیے اپنے کمرے میں داخل ہوتا۔ اور اکتا کر بیٹھی ہوئی صولت کو اپنی باہوں میں اس طرح جکڑ لیتا کہ دن کی ساری کلفتیں وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتی۔

"میری صولت! میں نے ذرا بھی دیر نہیں کی۔ بس ٹینس ختم کرتے ہی تمہارے پاس بھاگ آیا ہوں۔ وہ ضعیف شوقین اگر مجھے بخش دیتا تو میں کبھی ٹینس کھیلنے نہیں رکتا مگر تم تو جانتی ہو کہ وہ مجھے ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ آخر بوس ہی ٹھہرے اور اسی بہانے اکسرسائز EXERCISE بھی ہو جاتی ہے۔ دیکھو کل ایسا کرنا کہ تم بھی امتیاز کے ساتھ تین بجے ہی گراؤنڈ میں آجانا، وہاں ہم لوگ ساتھ ہی ٹینس کھیلیں گے۔ بولو آؤ گی نا؟" صولت جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیتی۔ سجاد کے اکسرسائز EXERCISE کے خیال ہی سے خوش ہو جاتی اور دوسرے دن کسی نہ کسی طرح کالج گراؤنڈ پہنچ ہی جاتی۔ سجاد کے دوست اسے خوش آمدید کہتے اور وہ جلدی جلدی سیر وں ہوا اپنے سینے میں بھر لیتی۔ تازہ ٹھنڈی صحت بخش ہوا جواب اُسے اِس بے ہنگم بدوضع حویلی میں

کم ہی ملا کرتی تھی۔ اگر وہاں ہوائیں بہتیں بھی تو اُسے بگولے ہی معلوم ہوتے تھے۔ مہینہ میں ایک آدھ بار وہ ایسے ہی کالج کی سیر کر لیتی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ روز روز اکتا دینے والا ماحول تو نہیں بدل جاتا۔ اُس کے ہاتھوں میں سہاگ کی مہندی کیا لگی جیل کی بیڑیاں پڑ گئی تھیں۔

یہ اچانک ہی اُس کی دنیا میں انقلاب آگیا تھا۔ کہاں اس کا چھوٹا سا کنبہ اور خوبصورت گھر۔ کہاں یہ لق و دق حویلی اور لمبا چوڑا خاندان۔ اس حویلی کے اطراف میں رہنے والے بھی اکثر اس خاندان کے اطراف ہی تھے۔ دن بھر ان کا تانتا بندھا رہتا اور جب جی میں آتا کوئی ایک فتنہ جگا جاتا۔ ہر گھر میں درجنوں بھر بچے موجود تھے۔ ایک سے اکیس سال تک کی عمر کی نندوں اور دیوروں کے چونچلوں سے وہ اکتا گئی تھی۔ بار بار وہ اس لمحہ کی زیادتی کو کوستی۔ جب وہ خواہ مخواہ ہی سجاد سے الجھ پڑی تھی۔

وہ ایک خوبصورت ساون تھا۔ اودا، اودا۔ آسمان پر گھٹائیں جھوم جھوم کر آئی تھیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کیمپس میں کئی چیزوں کا سیمینار ایک ساتھ چل رہا تھا۔ دور دور سے کالج کے ٹیچرس آئے ہوئے تھے۔ جونیر کلاسز کو ان سیمینار سے کوئی مطلب نہ تھا۔ مگر اس کی توشامت اُسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ آنکھوں میں صحت مندانہ چمک، ہونٹوں پہ دبی دبی سی مسکراہٹ لیے، انگ انگ شرارت سے بھرپور وہ اپنی دوستوں سمیت وہاں آدھمکی۔ جاتے وقت کون سے لمحے میں سجاد سے ملاقات ہوئی کہ وہ اس کا مقدر بن گئی۔ ہائے کہاں میرا چمکتا دمکتا شہر حیدرآباد اور اس کی سبک رفتار ہوائیں اور کہاں یہ گندی نالیوں والا محلہ نما غلیظ شہر۔ میں بھی کہاں پھنسی آکر۔ وہ بھاگ کر سجاد کی لائبریری میں پناہ لیتی۔ یہ بڑی حویلی سے ذرا الگ ہٹ کر چھوٹا سا خوبصورت کمرہ تھا۔ یہاں دیواروں سے لگی شیشہ کی الماریوں میں آرٹ اور لٹریچر کی کتابوں کا بہترین ذخیرہ تھا۔ ایک طرف ایک خوبصورت صوفہ سیٹ لگا تھا۔ کونر ٹیبل پر وینس ڈیمیلو، رابندر ناتھ ٹیگور اور بدھ کے مجسمہ

آراستہ تھے۔ دیواروں پر لیونارڈو داونچی، مائیکل اینجلو اور چغتائی کی شاہکار تصویر آویزاں تھیں۔ یہ چھوٹا سا کمرہ سجاد کی زندگی کا اثاثہ مکمل تھا۔ سجاد ایک ایک شاہکار صولت کو بڑے شوق سے دکھاتا۔ "یہ لاسٹ پیپر LAST PAPER کی پینٹنگ دیکھو صولت، جب جوڈس نے کرائسٹ کو دھوکہ دیا تھا۔ اسے میں نے فلوریڈا میں خریدا تھا۔"

"اور یہ مونا لیزا کی تصویر کو دیکھو۔ اس کے ہر انگ میں مسکراہٹ پوشیدہ ہے۔ اس کی آنکھوں کو دیکھو، اس کے ہونٹ تو دیکھو، گالوں کو دیکھو اور ...."

"تم نے کہانیاں لکھنی کیوں چھوڑ دیں صولت۔ اپنا وقت کیوں برباد کرتی ہو۔ میری جان۔ تم گھر اور آنگن کے ماحول میں خود کو کیوں کھپاتی ہو۔ دیکھو نا یہ لائبریری تمہاری ہے۔ یہ کتابیں تو پڑھو۔ یہ علم و ہنر کا خزانہ ہیں۔"

صولت بڑی دل جمعی سے پڑھنے بیٹھتی تو اس کا دل الجھنے لگتا۔ اسے اختلاج کے دورے پڑتے۔ کبھی وہ بیہوش ہو جاتی۔ گھنٹوں دل کی دھڑکن سے پریشان رہتی۔ ڈاکٹر آتے، ہر طرح کا معائنہ کرتے اور چلے جاتے۔

"کوئی تشویش کی بات نہیں صرف فنکشنل ڈیفکٹ FUNCTIONAL DEFECT ہے۔" وہ مسکرا کر کہتے۔

"بس انہیں ذرا گھومنے پھرنے کی تاکید کیجیے۔ لوگوں سے ملنے ملانے میں وقت گذار لیے اور ذہنی انتشار سے بچایئے۔"

صولت جلدی سے بازار جانے کا بہانہ ڈھونڈ لیتی۔ ساری کے میچنگ کا بلاؤز۔ دھانی دوپٹہ۔ نیلا فالس اور جانے الم غلم کتنی چیزوں کی فہرست بنا لیتی۔ لیکن اس کے معزز خسر کے مارواڑی دوکاندار موکل تھانوں تھان کپڑے بھجوا دیتے۔ اب بھلا بہوؤں میں دوکان ہی دوکان کہاں ماری پھرتی۔

صولت کے دل کی دھڑکنیں کچھ اور کبھی بڑھ جاتیں۔ سجاد اس کی بیماری سے سہم سہم جاتا۔ ڈاکٹر دوڑتے رہتے۔ بار بار معائنہ کرتے اور کسی طرح کی خرابی

نہ پاتے۔ تنگ آکر سجاد نے اس پرانی حویلی کو چھوڑ کر ایک پوش ایریا میں مکان کرایہ پر لے لیا۔ صولت گئی۔ چھوٹا سا خوبصورت مکان۔ اُسے سجا کر اس نے کندن بنا لیا وہاں کی شام بڑی رنگین ہوتی۔ آس پاس کی عورتیں خوبصورت لباس زیب کیے اکثر اس کے یہاں جمع ہوجاتیں۔ یا وہ خود ہی سج دھج کر اُن سے ملنے چل دیتی ــ ملنے ملانے کا کبھی اُسے ذرا زیادہ ہی خیال رہتا تھا۔ دن بھر وہ کہانی لکھتی یا اپنے گھر کو نت نئے انداز سے سجاتی رہتی۔ اس کی مصروفیتیں بڑھ گئی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں اب اُسے شاید ہی محسوس ہوتیں نہ اختلاج کا دورہ پڑتا۔

اس کی ملنے والیاں اکثر اس کی ہم عمر اور ہم خیال تھیں۔ یہ لمبے لمبے برقعے نہیں پہنتیں، بلکہ گپیں اور کوکری کی باتیں کیا کرتیں۔ صوفہ سیٹ کے ڈیزائن، کشن کی کڑھائی، ٹیپسٹری کے مختلف نمونوں کا ذکر ہوتا۔ حلوہ سے لے کر کیک، آئس کریم اور مختلف اقسام کی پڈنگ کی ترکیبیں بتائی جاتیں۔ فرج، اوون، اور ٹیلی وژن کے فوائد پر نہ ختم ہونے والے لکچر ہی شروع ہوجاتے۔ اس کے باوجود گفتگو کا اسٹاک ذرا خالی خالی محسوس ہوتا۔ دبی دبی زبانوں میں مسز فاروقی کی عیاری کا ذکر ہوتا۔ کبھی مسز رفیع احمد کی دقیانوسیت کا مضحکہ خیز تذکرہ ہوتا۔ کبھی مسز اختر کے غرور گھمنڈ کا ذکر چل پڑتا تو کبھی بیگم رشید کی لگائی بجھائی کا تذکرہ سبھوں کو جکڑ لیتا۔

بہرحال آس پاس اگر کسی کو چھینک بھی آجاتی تو اس کی خبر ذرا اہتمام سے ایک دوسرے تک پہنچائی جاتا۔ پھر عیادت کا سلسلہ شروع ہوجاتا ــ اور عیادت کے ساتھ تمام ہمدردیوں کے ساتھ بیگمات کے رکھ رکھاؤ اور ان کے طور و اطوار کا نہ ختم ہونے والا ذکر شروع ہوجاتا۔ صولت پر جلد ہی حقیقت روشن ہونے لگتی۔ وہ روز روز ان باتوں سے تنگ آگئی۔ کبھی کبھار اکتا کر وہ ان کی باتیں کاٹ دیتی اور ہنس کر کہتی، "دوسروں کی باتیں چھوڑیئے، اپنی ہی باتیں کیجیے نا۔" یا وہ شربت پیش کرتے ہوئے کہتی:۔

"پہلے یہ شربت پی لیجیے، گرم ہو جائے گا۔" لیکن صولت کا پیش کیا ہوا شربت آپس کے شکوہ شکایت کی پیاس نہیں بجھا سکتا تھا۔ اس پوش ایریا کی مہذب بیگمات کٹی ہوئی پتنگوں کی طرح آپس میں الجھ جاتیں۔ کبھی اسٹیٹس کا مقابلہ ہوتا۔ کبھی حسن اور تعلیم کا۔ ایک عجیب سی کشیدگی، عجیب تنفر آمیز محبت آپس میں پھلنے پھولنے لگی۔ صولت حیران تھی کہ اس کشیدگی اور تنفر آمیز محبت کے ساتھ کس طرح پیش آئے۔ بہت سوچ سمجھ کے اس نے معاملہ سلجھانا چاہا تو وہ اور بھی الجھ گیا۔ گھبرا کر اس نے مسز داؤد کی پناہ لی۔ وہ اس کی زبردست مداحوں میں سے تھیں۔ کم از کم وہ تو اسے ضرور سراہیں گی۔ آخر ایک جگہ رہ کر اتنی کشیدگی بھی کیا۔ لیکن مسز داؤد اپنی ایک نئی نویلی سہیلی پر صدقہ واری ہو رہی تھیں۔ ہفتہ عشرہ قبل وہ ان کے بازو والے مکان میں آئی تھیں۔ مسز داؤد نے صولت کو ذرا بھی لفٹ نہیں دی۔ وہ بڑی مایوس اور رنجیدہ سی واپس آئی۔ اُسے اچانک ہی اپنی تنہائی کا جان لیوا احساس پھر ستانے لگا۔ سجاد کالج سے واپس آئے تو وہ ویسے ہی تکیہ پر اوندھی لیٹی تھی۔

"کیا ہوا صولت؟ ایسے کیوں لیٹی ہو میری جان؟" وہ کچھ بوکھلا سے گئے۔

"کچھ نہیں، وہی پرانا مرض پلپیٹیشن PALPITATION ہو رہا ہے۔" اس نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ سجاد الٹے پیروں واپس گئے۔

ڈاکٹر آئے۔ معائنہ کیا اور گمبھیر آواز میں بولے "ہارٹ اٹیک معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رشید فاروقی سے کنسلٹ کیجیے۔"

میں اور وہ

بڑے دکھ کا سمے تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ۔ کون تھا وہ۔ کوئی تو تھا۔ ایک انسان۔ ایک منش۔ ہمارے تمہارے جیسا۔ لیکن وہ مر رہا تھا اور میں اسے مرتے دیکھ رہا تھا۔ پر اس سمئے میں بھی پتھر کی طرح سرد اور بے حس تھا۔ گویا میں بھی مر چکا تھا۔ یہ سچ بھی تھا کیونکہ جس منش کی آتما مر جاتی ہے وہ کب زندہ رہتا ہے، اسے زندہ اندھے اور نا سمجھ ہی سمجھ سکتے ہیں جو گھپ کالی راتوں میں دشاؤں کا گیان اپنے ہاتھوں سے چھو کر اور ٹٹول کر کرتے ہیں۔ اور یہ گیان بھی کیسا ہوتا ہے جیسے کبھی چھ اندھے باشیوں نے ہاتھی کو چھو کر رسی پنکھا اور پہاڑ بتایا تھا۔

اس کے جبڑے کی ہڈی ابھر آئی تھی۔ چہرے کی نسیں پھول رہی تھیں، آنکھوں کے گڈھے میں پتھرائی آنکھوں ڈگ ڈگ کر رہی تھیں۔ اور دبلے پتلے سیاہی مائل ہاتھ پیر پرانی لکڑی کی طرح سیاہ، سخت اور بے جان معلوم ہو رہے تھے۔ اس کا پیٹ اندر دھنس رہا پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ کمزوری اور نقاہت سے اس کی آواز بھی ڈوب چلی تھی۔ تھوڑی دیر قبل تک وہ بار بار میری خوشامد کر رہا تھا۔

اور گڑگڑا کر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے بھوک لگی ہے سو میں نے اسے کچھ کھانا دے دوں ورنہ وہ مر جائے گا اور میں نے سوچا بھی تھا کہ اسے کھانا ضرور دے دوں گا۔ اس لیے کہ میرے پاس پوری ایک روٹی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر بیحد دکھی ہو گیا تھا۔ سوچا تھا، آدھی روٹی کھا کر آدھی اسے دے دوں گا۔ دونوں ہی کا پیٹ بھر جائے گا۔ سو میں نے جلدی جلدی آدھی روٹی کھالی۔ مجھے بھی تو بھوک لگی تھی۔ وہ للچائی نظروں سے مجھے اور میری روٹی کو تکتا رہا۔ میں نے آدھی روٹی کھا کر پانی پیا اور ایک لمبی ڈکار لی۔ اطمینان اور چین کی لہر میرے اندر ہی اندر دوڑ گئی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ چین ہی چین تھا۔ سو میں بھی آرام سے اپنا ہاتھ پیر لمبا کرنے لگا۔ نیند کے جھونکے آنے لگے اور میں جھومنے لگا۔ چین، سکون اور اطمینان کے گہوارے میں۔ میری آنکھوں میں نیند کی دھند چھا رہی تھی۔ ویسے میں نے دیکھا، ایک کریہہ سی مخلوق ڈگ مارتی میری طرف آ رہی تھی۔ میں ڈر گیا "کون ہو تم؟" نیند سے چونکتے ہوئے میں نے چیخ کر پوچھا، لمبے لمبے بیحد پتلے سیاہ پیر کچھ اور آگے بڑھے۔ پھر ویسے ہی پتلے لمبے کوئلہ کے رنگ سے ملتے جلتے ہاتھ میرے سامنے پھیل گئے، آنکھوں کے گڈھے میں ڈگ ڈگ کرتی آنکھیں، چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور حلق سے خرخر کرتی آوازیں۔ وہ ہاتھ پھیلائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ "کون ہو تم؟" میں نے دوبارہ چیخ کر پوچھا اور پھر خود ہی سمجھ گیا۔ یہ تو وہی تھا جو بھوک سے مر رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی آدھی روٹی اسے دے دوں گا کہ وہ بھی زندہ رہے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر نہ جائے کہ میرے پرکھوں کا یہی دستور تھا۔ سو مجھے بھی ویسا ہی کرنا چاہیے۔

اس نے پھر روٹی مانگی۔ بھوک سے اس کی آواز بہت مدھم تھی اور میرے کانوں تک مشکل سے پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اپنی آدھی روٹی کو دیکھا۔ باہر زور زور سے ہوا چل رہی تھی اور آہستہ آہستہ آندھی میں تبدیل ہو رہی تھی لیکن اس طوفانی موسم میں اگر مجھے بھوک لگ گئی تو روٹی کون دے گا؟ دل میں،

ایک خوفزدہ خیال جاگا پھر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن گیا۔

میں اسے روٹی کیوں دوں ؟ یہ تو میری محنت کی روٹی ہے۔ میرے پورکھوں کا کیا، انہوں نے روٹی تو کیا، بادشاہت بانٹ دی اور خود پیٹ پر پتھر باندھ کر مر گئے، تو کیا میں بھی ان کی بیوقوفی پر عمل کروں، نہیں۔ میں اسے روٹی نہیں دوں گا، اس لیے کہ میں آج کا ایک ہوشمند انسان ہوں۔

اس روٹی کو میں رکھ دوں گا۔ آئندہ کے لیے جب مجھے بھوک لگے گی اور باہر طوفانی ہوائیں چل رہی ہوں گی۔ باہر آندھی چل رہی ہے۔ ممکن ہے طوفان آجائے کیا اعتبار ہے وقت اور زمانے کا۔ میں نے اپنے پورکھوں کا چلن چھوڑ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ میں پریشان تھا۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ باہر مجھے ہر طرف شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دیتی۔ زور زور سے غصہ میں دہاڑتا ہوا شیر اگر مجھے پا لیتا تو چیر پھاڑ کر ختم ہی کر دیتا۔ کبھی اس کے نوکیلے دانت مجھے اپنی ہڈیوں میں چبھتے محسوس ہوتے۔ گویا وہ میری ہڈیاں ہی چبا جائیں گے۔ اور جب باہر شیر کا ڈر نہیں ہوتا تو میرے اندر اندر گرم لو کے بگولے چلنے لگتے۔ یا باد سموم کے جھونکے محسوس ہوتے جو اندر مجھے جھلس دیتے۔ میرا دل اداسیوں کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جاتا۔ میری نظریں اس آدمی پر جم جاتیں بھوک سے مر رہا تھا۔ بڑے دکھ کا سمئے تھا۔ پر میں اس کی طرف سے نظریں گھما لیتا۔ گویا میں اندھا اور بہرہ تھا اور میرے ذہن پر مہریں لگی تھیں۔ چاروں اور گھپ اندھیرا تھا۔ میں دشاؤں کا گیان ٹٹول رہا تھا اور گیان بھی کیسا، جیسے کچھ اندھوں نے ہاتھی کو چھو کر لگایا تھا۔ شاید میں ویسا ہی اندھا تھا۔ جب آتما مر جاتی ہے تو منش کے پاس رہ بھی کیا جاتا ہے فقط ایک اندھا، بہرہ، بے حس شریر۔

مجھے سمئے نہیں تھا۔ ابھی مجھے ایک کانفرنس میں جانا تھا۔ پھر بیرون ملک سے آئے ہوئے ڈیلیگیٹس کے ساتھ لنچ میں شریک ہونا تھا۔ آج ہی ایک مشہور شاعر کی کتاب کا اجرا بھی تھا جس میں مجھے صدارت کرنی تھی۔ میں نے اس کی کتاب ابھی

پڑھی نہیں تھی اپھر بھی میں جانتا تھا کہ میری ہی تقریر سب سے اچھی ہوگی۔ میری کامیابی کا راز میری زبان دانی ہی تو تھی۔ یا شاید زبان درازی کہیئے۔ بہرحال مجھے رات کے بارہ بجے تک VIPs سے ملنا بھی تھا۔ میں آج کے دور کا ایک کامیاب انسان ہوں۔ ایک زمانہ میرے پیچھے دیوانہ ہے اور جب سارے لوگ میری ہی طرف دیکھ رہے ہوں تو بھلا میں دوسروں کو کیا دیکھتا۔

میرے گوڈاؤن میں اناج کی بوریاں بھری ہوئی تھیں اور ان بوریوں کے ایک ایک دانہ کو میں نے سنبھال کر اور گن کر رکھا تھا۔ میں نے چڑیا پکڑنے والی ایک گاڑی کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ تاکہ اگر کسی روشندان سے کوئی گستاخ چڑیا گودام میں گھس کر بوریوں میں اپنی چونچ سے سوراخ کر ڈالے اور میرے اناج کے دانوں کو چگ جائے تو میں انہیں سزا دے سکوں۔ مجھے ان سب کے سب دانوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ میں بہت بڑا آدمی بن گیا تھا اور جب منش بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی ضرورتیں بھی بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اس کا STATUS گودام کی بوریاں کے سبھی دانوں کو کھا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ مرتا ہوا انسان میں کیسے دیکھ پاتا۔

بڑے دکھ کا سمئے تھا کہ وہ مر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اور میں پتھر کی طرح سرد اور بے حس تھا۔ میری آتما مر چکی ہے اور میں دشاؤں کا گیان ان اندھوں کی طرح کرتا تھا جنہوں نے کبھی ہاتھی کو چھو کر رسی پنکھا اور پہاڑ بنایا تھا۔

انٹرویو

پبلک سروس کمیشن کے کمپاؤنڈ میں قدم رکھتے ہی اُسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا. ایک سرور کا احساس، جیسے اُس نے کوئی خمار آلود مشروب پی ہو. فتح وکامرانی کی مشروب جس کی انہوں مسرّت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو. اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں. شانوں تک بکھرے بال نیچے کی طرف دو چھوٹی چھوٹی کلپ سے بندھے تھے. اونچے لمبے قد اور جسم کے خوبصورت نشیب و فراز پر شیفون کی پھولدار ساڑی بہت سج رہی تھی. اُس کا مجموعی تاثر بڑا دل خوش کن تھا. جیسے بہار کا تازہ پھول. اُس نے اپنے ساتھ شامل ہونے والے امیدواروں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور غرور سے سر بلند ایک بدحواس سے لڑکے سے خواہ مخواہ ہی الجھتی سلجھتی رہی. کوئی اُس کی بکواس سننے کے موڈ میں نہ تھا. سب اپنی ہی بدحواسیوں میں مگن تھے. انٹرویو شروع ہو چکا تھا. مقابلہ سخت تھا. لڑکے اور لڑکیوں کی ایک لمبی تعداد آس و نراش کے درمیان ہچکولے کھاتے یکے بعد دیگرے اپنی قسمت آزمانے چلے جا رہے تھے. ایک وہ تھی کہ اطمینان سکون کے سبب سے اونچے زینہ پر قدم جماتے اپنے ساتھی امیدواروں کو زہرخند سے

تکتی اپنے سر کو بڑے دلربانہ انداز میں جھٹک جھٹک دیتی تھی۔ اس کی ہر اداشان بے نیازی کی آئینہ دار تھی۔ اس دفعہ اس نے اپنے سبھی کیل کانٹے درست کر رکھے تھے۔ اور اپنی حماقتوں کا لامتناہی سلسلہ ختم کر دیا تھا۔

یہ آج کی بات نہیں تھی بلکہ دس سال قبل سے ہی وہ اپنی حماقتوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ آنرز، ایم اے، ریسرچ، ایکسپیرینس جیسے انٹلکچوئل گورکھ دھندوں کے آئیڈیل کو ایک زمانہ تک سینہ سے لگائے وہ بہت سی خوش فہمیوں میں مبتلا رہتی لیکن مشکل یہ ہو جاتی کہ ہر آئیڈیل اس کے ہاتھوں سے پھسل کر چکنا چور ہو جاتا۔ اس فراخ دلی کے زمانہ میں جب کوئی کسی کو کچھ دے دینے کی سعی مسلسل میں مصروف ہوتا تو وہ اپنے دونوں ہاتھ سمیٹ کر اس طرح پیچھے کھسکتی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو یا کسی بھیانک خواب سے جاگ کر لرز رہی ہو۔ اسے وہ مشہور زمانہ جھاجھی یاد تھے جن کی گستاخ نگاہوں سے بے چین اس کی ساتھی رونو بولائی بولائی پھرتی تھی۔ اونچے کلاسز میں پروفیسرز کی نظروں کی گستاخیاں تو خیر معاف ہی تھیں لیکن مشکل تو اس وقت پیش آتی جب گستاخیاں سہنے والی میرٹ MERIT پر امتحانات کے نمبر بٹنے لگتے یا پھر رونو جن مشکلات سے دوچار ہوئی تھی۔ ویسی کتنی ہی مشکلیں پیدا ہو جاتیں۔ بیچاری رونو ابھی جھاجھی نظروں ہی کی تاب نہ لا پائی تھی کہ ایک نیا شگوفہ پھوٹا۔ انہوں نے اپنے بیٹا کی شادی کے لیے پیام بھیجا تھا۔ اس کے پاپا کو اس رشتہ میں جب کوئی برائی نظر نہ آئی تو انہوں نے پوری سنجیدگی سے اس کا منشار دریافت کیا۔ وہ جی جان سے سلگ اٹھی۔ جھاجھی کی گستاخیوں کا ذکر وہ اپنے پاپا سے تو خیر کیا کرتی لیکن انکار لازمی تھا اور نتیجہ معلوم۔ بھلا ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ سے کوئی کہاں ٹکر لے سکتا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اپنی لائن ہی بدل دی۔ وہ بھی ایسی کتنی ہی گستاخیوں کی مرتکب ہوئی تھی۔ کالج کی ٹاپ موسٹ TOP MOST لڑکیوں میں اس کا شمار تھا۔ کالج پہ چھا جانے کے ساتھ ساتھ وہ نہ جانے کتنوں کے دلوں پر بھی چھا گئی تھی۔ لیکن اس بددماغی کا کیا جواب کہ وہ کسی کی نظر سمجھی نہ ادا۔ ہر سوال کا

جواب اس نے تبسم تجاہل عارفانہ سے دیا اور اب اسی تبسم عارفانہ کا خمیازہ وہ ہر قدم پر بھگت رہی تھی۔ اس کی خود اعتمادی کا بے پناہ سکون اور مستحکم ارادے متزلزل ہو رہے تھے۔ ہر انٹرویو میں کچھ عجیب ہی حادثہ پیش آتا۔ ہر جگہ VIP's کے چمچے بڑی کثرت سے بکھرے پڑے تھے۔ اور کوئی اپائنٹمنٹ ان چمچوں کی ناز برداری کے بنا مشکل سے نہیں ناممکن تھا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا بے حد مشکل۔ کہاں وہ اس کی وہ شانِ استغنائی اور کہاں یہ ڈیپارٹمنٹ اور VIP's کی چمچہ گیری۔ اس کے دل و دماغ کو اتنے جھٹکے لگے کہ وہ بدحواس ہو گئی۔ بلندی سے گرنے کا احساس بھی کیسا جان لیوا ہوتا ہے اور یہ ظالم احساس اس کی رگ و پے میں سرایت کیے جا رہا تھا۔ اُس کا وہ خودسر انداز اچانک ہی ٹوٹنے پھوٹنے لگا تھا۔ اپنی ہی نظروں میں اس کا وجود اتنا حقیر سا ہو گیا تھا جیسے جیسے وہ ایک دم سے چھوٹی ہو گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی پھوٹتی رہی۔ شاید وہ کوئی تیر نیم کش تھا، جو دل میں کھب کے رہ گیا۔ ناکامی کے جان لیوا احساس اور خودداری کے زعم تلے وہ چکنا چور ہوتی رہی۔ لیکن اس کی ضدی طبیعت اتنی آسانی سے شکست قبول کرنے کو تیار نہ تھی اس نے بہت سی باتیں سوچیں اور بازی جیت لینے کی قسم کھائی۔ اب کے اس نے ایک سال قبل سے ہی دانہ ڈالنا شروع کیا۔ اپنے لیے دیئے رہنے والے انداز کو جھٹک کر اچانک وہ بڑی دلبر نظر آنے لگی۔ اس کے ہونٹوں کے خم گہرے ہو گئے۔ آنکھوں کی چمک طلسم سازی کے جال بننے لگی۔ اس کے چمکیلے ہونٹ بال اس کے چہرے کے گرد ہالہ ڈالے رہتے اور جسم کی لچک گلاب کی ڈالی کی یاد دلاتی۔ اس کے ملنے والوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اور اُس نے اپنے سبھی کیل کانٹے درست کر لیے۔ راستے ایک نہیں کئی ایک تھے۔

انٹرویو سے ایک ماہ قبل ہی اس کی اہمیت مسلم ہو گئی تھی۔ اس کی قابلیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ساحری سیکھ لی تھی۔ اس لیے انٹرویو سے ایک دن قبل ہی اسے نتیجہ معلوم تھا۔ انٹرویو میں پوچھے جانے والے سوالات بھی معلوم تھے۔ فتح و کامرانی کے سرور میں وہ ڈوبی جا رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ بت مشکل پسند ہاتھ آیا تھا۔

اندر انٹرویو کا سلسلہ جاری تھا۔ باہر اُمیدوار بے چین بے چین پھر رہے تھے۔ وہ امیدواروں پر تمسخرانہ نظر ڈالے اپنے سر کو بار بار جھٹک رہی تھی۔ جیسے کسی تکلیف دہ خیال سے چھٹکارہ پانا چاہتی ہو۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی تمام کھڑکیوں اور کواڑوں کو مقفل کر لیا تھا۔ تاکہ کوئی خیال، کوئی تکلیف دہ خیال اس بیش قیمت لمحہ کو ضائع نہ کرے لیکن دل جیسے بغاوت پر آمادہ تھا۔ لگاتار کوئی دل کے چور دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ یا دماغ پر ہتھوڑے مار رہا تھا؟ بہرحال کچھ تو ضرور تھا۔ وہ بڑی بے چین سی تھی۔ انجان سی خلش اُس کے دل کو چکنا چور کیے جا رہی تھی۔ اپنی ہی نظروں میں اس کا اپنا وجود اتنا چھوٹا سا ہوگیا تھا۔ اتنا حقیر سا۔ ایک دفعہ پھر وہ اپنی تمام خود اعتمادیوں کے ساتھ کمیشن کے سامنے تھی۔ لیکن اندر ہی اندر جیسے وہ ٹوٹ رہی ہو۔ شکستہ شکستہ چور چور۔ جانے بوجھے سوالات دہرائے گئے۔ رٹے رٹائے جملے اس نے سنا دیئے۔ اُس کا انٹرویو بہت اچھا ہوا۔ اس جمہوری حکومت کے ایرے غیرے درباریوں نے اسے بہت سراہا۔ وہ باہر آئی تو ایک شکست خوردہ مسکراہٹ اُس کی لبوں سے چپک کے رہ گئی۔

زیادہ دن نہیں گذرے۔ جلد ہی وہ حسین پروانہ اس کے ہاتھ آیا جس کے پیچھے وہ جان دیئے جاتی تھی۔ وہ دن بھی آ گیا جب اُسے جوائن کرنا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس بُت مشکل پسند کو چوم کر سنبھال کر اپنے پرس میں رکھا اور سروس جوائن کرنے کے لیے تیار ہونے لگی۔ آج پھر وہی انداز دلربائی تھی۔ اس کی زلفیں شانوں پر دو چھوٹی چھوٹی کلپ سے بندھی ہوئی تھیں بساری میں لپٹا لپٹایا جسم بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی وہ دیر سے اپنے سراپا کو تک رہی تھی۔ خوب صورت چہرہ، اُس کا اپنا چہرہ بڑا اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی اداس ہوئی جا رہی تھی۔ خوب صورت جسم کے اندر تڑپتا پھڑکتا دل نہ جانے کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ جیسے اس نے کوئی گناہ: کیا ہو یا کسی کو قتل ہی کر ڈالا ہو۔ اس کے ساتھ انٹرویو میں شامل ہونے والے سبھی لڑکے

لڑکیوں کا چہرہ اس کی آنکھوں تلے گھوم رہا تھا۔ حیران پریشان اور بدحواس سا ہجوم ان میں نہ جانے کون سب سے زیادہ حقدار تھا جس کا اس نے حق بڑی شان سے مارا تھا۔ اُسے اپنے پچھلے تمام انٹرویو یاد آ رہے تھے۔ خوب صورت سے جسم میں خوب صورت سی روح کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں گری جا رہی تھی۔ گھبرا کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ خوب رو دھو کر جب کسی قدر دل کو ڈھارس بندھی تو اپنے محبوب پروانہ کو پرس سے نکال کر ایک بار پھر چوما اور اس کے ٹکڑے کرنے لگی۔ دو، چار، آٹھ، سولہ اور اَنگنت ٹکڑے۔ کمرے میں چاروں طرف دھجیاں ہی دھجیاں بکھر گئیں۔ ایک عجیب سی تھکاوٹ کے احساس کے ساتھ اُس نے اپنے کپڑے بدلے اور پلنگ پہ گر کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

قوم کے نام پر ۔ اللہ کے نام پر ۔ نادار اور مفلس بچوں کے نام پر کام کیجیے ۔ بھلائی کیجیے کہ اپنی قوم کی حالت تشویشناک ہے ۔ بیحد تشویشناک ۔

خاموشی ——— خاموشی ——— سناٹا ۔ خدا کے لیے ۔ قوم کے لیے ۔ انسانیت کے لیے محنت اور ایثار چاہیے کہ یہ ایثار و قربانی کا وقت ہے ۔ یہ ایثار و قربانی ، ہم اور آپ جیسے معتبر اور باشعور لوگ نہ کریں تو پھر کون کرے گا کہ قوم بے شعور ہو گئی ہے ۔

میں اپنے تین ماہ کے شیر خوار بچے کی طرف دیکھتی ہوں جو خواب میں کبھی چونک کر رونے لگتا ہے ۔ کبھی ہنس پڑتا ہے ۔ یہ بھی تو قوم کا ایک فرد ہو گا ۔ اس لیے اس کی خدمت بھی قوم کی خدمت ہی ٹھہری ۔

وقت چاہیے ۔ محنت چاہیے کہ قوم کی حالت ...... سرخ اینٹوں والی دو منزلہ عمارت کے وسیع کمرے کے دریچے سے جھانک کر نیچے دیکھتی ہوں جہاں میونسپلٹی کے لگے نل پر عورتیں ، بچے اور لڑکے زور زور سے لڑ رہے ہیں ۔ لڑ رہے ہیں یا باتیں کر رہے ہیں کہ اب ان کے بولنے اور جھگڑنے میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا ہے ۔ وہ اسی طرح گالیوں اور تبروں کے ساتھ باتیں کرنے کے عادی

ہو چکے ہیں۔ ہر روز صبح انہیں کی اذان سے جاگتی ہوں کہ میں بھی اسی ملی جلی آواز کی عادی ہو چکی ہوں۔ اس محلہ میں قوم کی حالت اور تعلیم یافتہ افراد رہتے ہیں۔ جو ڈاکٹر، وکیل، انجینئر یا بزنس مین ہیں۔ ان میں سے اکثر باہر سے آکر بس رہے ہیں۔ کچھ اسی محلہ کے میلے گندے باشندے ہیں جو اپنی پستیوں میں مگن ہیں۔ نل کے داہنے اور بائیں دونوں طرف دو گندی سی گلیاں ہیں جہاں سے صبح و شام کئی خوبصورت لڑکیاں اسکول کالج کی طرف جاتی اور واپس آتی ہیں۔ یہ برقعہ نہیں پہنتی صرف ان کی مائیں برقعہ پہنتی ہیں۔ کہ وہ شریف گھرانے والیاں ہوا کرتی ہیں۔ اور اب وقت کا تقاضا کچھ اور ہے۔ شاید اسی لیے ان گلیوں کے نکڑ پر ہمیشہ محلہ کے شوقین لڑکے کھڑے ہوتے ہیں۔ جو ہر طرح کے تفریحی پروگراموں کے شوقین ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ گھر کے اندر کم اور باہر زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان کی عمریں بس اتنی ہیں کہ مسیں بھیگتی نظر آتی ہیں۔ یہ شوخ کپڑے پہنتے ہیں اور اکثر لال اور کالے شرٹ پینٹ پہنے ہوتے ہیں۔ چوڑے بلٹ بڑے بڑے بال۔ آنکھوں پر گاگلس لگائے سجے دھجے خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی کسی برآمدے میں بیٹھے کیرم یا تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ پاس ہی ٹرانزسٹر زور زور سے بجتا ہے یا کبھی ریکارڈ پلیئر کی گونجتی آوازیں قوالیوں کی بھرپور تانیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی یہ قوالیاں وسٹرن میوزک WESTERN MUSIC کی تیز دھنوں میں کبھی بدل جاتی ہیں۔ کہ ان کے درمیان وسٹرن میوزک اور گانے ایک فیشن بن کر آئے ہیں۔ وہ ان گانوں کی دھنوں کو سمجھے بنا ہی ایسے جھومتے ہیں جیسے ناگن سپیرا کے بین پر۔ یہاں معاشی فارغ البالی ہے کہ ان کے والد سرکار کے بڑے یا چھوٹے عہدوں پر مامور ہیں۔ اسلئے ان کے پاس روپیہ کی بہتات ہے اور ان کی اولاد کے پاس وقت کی۔ ان میں سے اکثر میٹرک یا آئی۔ اے تھرڈ ڈویژن سے پاس ہیں۔ اور آئندہ کسی انسٹی ٹیوٹ میں داخلے کا راستہ ان کے لیے بند ہو چکا ہے۔

تین اور چار کے درمیان کا وقت ہے۔ میں سرخ اینٹوں والے دو منزلہ

مکان کے وسیع کمرے سے جھانک کر نیچے دیکھتی ہوں۔ گلی کے نکڑ پر ایک مکالمہ جاری ہے:
"تے کو ما ئے بہن نہیں ہے رہے تے کا ہے کو لڑکی کو چھیڑا۔"
"تے تو خود بڑا گرو ہے مخدو بھائی۔ تے مے کو جانتا نہیں۔"
"ارے یار چھوڑ۔ جا اپنے راستے، دوسرے کے بیچ تے کا ہے کو....."
"سینہ توڑ دوں گا حرام زادے.... مے کو بھیجول....." واقعی قوم بے شعور ہو گئی ہے۔"
"مسنر صولت سجاد! آپ تھوڑا سا بھی وقت اس بدنصیب اسکول کے لیے نکالیے کہ اپنی قوم کی مدد ہم اور آپ نہ کریں تو پھر کون کرے گا۔"
خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے وکیل صاحب نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"مشکل یہ ہے کہ وکیل صاحب کہ اسے اسکول کہتے ہوئے بھی تو شرم آتی ہے۔ پھر یہ کہ میرا اتنا چھوٹا سا بچہ......."
"آپ نے ہمیشہ مجھے مایوس ہی کیا ہے مسنر سجاد! لیکن آج میں آپ سے وعدہ لیے بغیر نہیں جاؤں گا کہ اس اسکول کو آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔"
"میں کوشش کروں گی۔"
"کوشش نہیں وعدہ کیجیے کہ آپ اسکول کو وقت دیں گی۔ کچھ بھی سہی تھوڑا ہی سہی۔ قوم کے نام پر، اللہ کے نام پر، نادار و مفلس بچوں کے نام پر چندہ دیجیے۔ اپنے سرمایہ کا۔ اپنی محنت کا۔ اپنے قیمتی اوقات کا۔ رحم، ہمدردی اور خلوص کا کہ قوم کی حالت تشویشناک ہے۔ بیحد تشویشناک۔"
وکیل صاحب ——— زندہ باد ——— مسیحا رقوم ——— زندہ باد ——— بیگم سجاد ——— زندہ باد ——— مینار قوم ——— پائندہ باد۔"
"مت کرو، گندی حرکتیں بند کرو کہ تم میری عزت ہو۔"

" جاؤ اور امتحان دو .... غلط کام نہ کرنا کہ تم قوم کی عزت ہو۔ "

بیگم سجاد ——— زندہ باد

گرلس اسکول ——— پائندہ باد ———!

" چندہ دیجیے ، روپیہ دیجیے کہ یہ آپ کا اسکول ہے۔ آپ کی قوم کی بچیوں کا اسکول۔ "

" مگر وکیل صاحب اس طرح کب تک چلے گا؟ آخر آپ اسے RECOGNISE کیوں نہیں کرواتے؟ غریب ٹیچرس کب تک اپنا خون پسینہ بغیر کسی معاوضہ کے بہاتی رہیں گی۔ "

" آپ بہت جلد باز ہیں مسز سجاد۔ صبر سے کام لیجیے۔ کسی بھی عظیم کام کو کرنے کے لیے ایثار و قربانی دینی ہی ہوتی ہے۔ "

" وکیل صاحب! بغیر کسی موٹیویشن MOTIVATION کے ایمانداری سے محنت کبھی نہیں ہوسکتی۔ اتنی چھوٹی سی بات بھی نہیں سمجھ پاتے ہیں آپ؟ کیا اسکول کو پیلے جیسا کلب یا گپ بازی کا اڈہ بنانا چاہتے ہیں۔ "

مسیحا رقوم ——— زندہ باد

رہنما رقوم ——— زندہ باد

" بیگم سجاد! آپ کو مبارک کہ اسکول RECOGNISE ہوگیا۔ "

" وکیل صاحب آپ کو مبارک کہ آپ نے ثواب جاریہ حاصل کیا۔ "

" اس چیک پر دستخط کردیں مسز سجاد! "

" یہ کون سا چیک ہے وکیل صاحب؟ اس ماہ کے چیک پر تو میں نے دستخط کرہی دیا تھا۔ "

" آپ ان الجھنوں میں نہ پڑیں مسز سجاد! "

ہاہاہاہا ——— ہاہاہاہا ——— ہاہاہاہا ——— ہاہاہاہا ———

——— ہاہاہاہا!

"یہ کیا بات ہوئی - آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ؟ "
"گھبرانے کیوں ہیں مسز صولت سجاد ! آپ کا شیر SHARE محفوظ رہے گا."
"میں آپ کی باتیں بالکل ہی نہیں سمجھی آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں. "
"آپ سمجھ کر بھی کیا کریں گی ، صرف دستخطیں کرنی چاہیئں. "
"میں میٹنگ کے دوران ہی دستخط کروں گی ، آپ پہلے میٹنگ بلالیں. "
" دیکھئے مسز سجاد ! ہر بات کے لیے اس طرح ضد نہیں کرتے. میں نے کہا ناکہ آپ کے حصے میں کوئی کمی نہیں آئے گی. "
"وکیل صاحب ! اٹھالے جائیے اپنے کاغذات میں دستخط نہیں کروں گی. مجھے بھی آپ نے کوئی چور سمجھ رکھا ہے. "
"چوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. یہ تو اپنی محنت کا معاوضہ ہے ! پھر آپ ہی کہا کرتی تھیں کہ بغیر موٹیویشن کے ایمانداری سے محنت نہیں ہوسکتی. کیا اتنی چھوٹی سی بات بھی نہیں سمجھ پاتی ہیں آپ ؟ "
" معاف کیجیے گا وکیل صاحب ! MOTIVATION کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ایثار و قربانی کی بھیک مانگنے والے رہنمائے قوم کو بھی معاوضہ کی ضرورت ہوتی ہے. یہ بات سمجھ میں نہیں آتی. "
"آپ دستخط کردیں مسز سجاد ، فضول مباحثے سے کیا حاصل. "
"میں دستخط نہیں کروں گی. "
"برے پھنسے وکیل صاحب. مسز سجاد تو کچھ سنتی ہی نہیں. "
" انہیں سننا ہی پڑے گا. "
" یہ محض آپ کا خیال ہے. وہ بھی کوئی انوار صاحب نہیں کہ جب چاہا راستہ صاف کر دیا. آپ انھیں نہ کسی کام کے لیے مجبور کرسکتے ہیں نہ بہ آسانی برطرف ہی کرسکتے ہیں. برے پھنسے وکیل صاحب بہت برے. "
" انہیں ہمارے راستہ چلنا ہی ہوگا ورنہ راستے ایک نہیں کئی ایک ہیں. "

سرخ اینٹوں والی دو منزلہ عمارت کے وسیع کمرے میں میں کفن بردوش چھپر کھٹ پر لیٹی ہوں۔ میونسپلٹی کے لگے نل پر عورتوں بچوں اور مردوں کے باتیں کرنا یا جھگڑنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ میں یہ آوازیں آج آخری بار سن رہی ہوں۔ اس کے بعد پھر کبھی نہ سن پاؤں گی۔ اسلیے نہیں کہ اپنی قوم کے طور و اطوار میں فرق آگیا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میں چند ہی ساعتوں بعد اپنی آخری منزل کی طرف کوچ کر جاؤں گی۔ میرا وسیع کمرا اور یہ سرخ اینٹوں والا مکان عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ خاندان کی کچھ عورتیں روتی ہوئی مجھے تابوت کی طرف لے جا رہی ہیں۔ دو پولس آفیسر بھی وردی پہنے ڈیوٹی پر ہیں کہ آج کھول سے میں زہر پی گئی ہوں۔ قصہ یوں ہے کہ آج ٹھیک ساڑھے دس بجے میں اسکول پہنچی تھی۔ میرے پہونچنے کے چند لمحوں بعد ہی آفس کے کسی کام سے وکیل صاحب بھی کمیٹی کے ..... ایک ممبر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے تھے۔ میں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ پھر دیر تک اسکول کی فلاح و بہبود کے متعلق ان کے ساتھ بیٹھی اسکیمیں بناتی رہی۔ اسکول کے سامنے والی چائے کی دوکان سے چائے منگوا کر انہیں پیش کیا اور خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھی چائے پیتی رہی۔ لیکن میری پیالی میں زہر گھلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا، سو میں پی کر بیہوش ہو گئی پھر مر گئی اور اب اس تابوت میں لیٹی اپنی آخری منزل کی طرف جا رہی ہوں۔ جس دوکان سے چائے آئی تھی اس کا مالک گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ بیچاری بوڑھی بوا جو عرصہ سے وہاں ملازم تھی۔ اور وہی چائے لائی تھی۔ وہ بھی حراست میں ہے۔ میں چائے پینے کے دوران صرف چند منٹوں کے لیے اپنی ادھوری پیالی چھوڑ کر کلاسوں کی طرف گئی تھی کہ وکیل صاحب نے کچھ دریافت کیا تھا۔ پھر اپنی بقیہ چائے بھی آکر پی گئی تھی۔ میری لاش کے چیتھڑے اڑ گئے ہیں۔ اس لیے کہ میں نے زہر پیا تھا سو قانوناً پوسٹ مارٹم ضروری تھا۔ میرے گھر والوں نے میری لاش کو اس جھنجھٹ سے بچانے کی بہت کوشش بھی کی لیکن وہ کامیاب نہ

ہو سکے، سو میری لاش کے چیتھڑے اڑ گئے ہیں۔

سورج تاریکیوں میں چھپ گیا ہے اور میں قبر کی تاریکیوں میں گم ہوں۔ لیکن میری آنکھیں اسکول کے در و دیوار کو تک رہی ہیں اور ہمیشہ تکتی رہیں گی۔ کہ اسے میں نے اپنے خون پسینہ سے سینچا تھا اور اب اس کا ازالہ ہو رہا ہے۔ لڑکیاں زور زور سے رو رہی ہیں کہ وکیل صاحب کہیں سے میری ایک بہت بڑی تصویر بنوا لاتے ہیں اور اسے اسکول کے آفس میں ٹانگا جا رہا ہے۔ اس پر ایک خوبصورت مالا بھی پہنائی گئی ہے۔ لڑکیاں ہچکیوں سے رو رہی ہیں۔ وکیل صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ اور میں اپنے چھوٹے سے بچے کو چھوڑ کر قبر کی تاریکیوں میں گم ہوں۔

دل کا کیا رنگ کروں

ایک چھوٹے سے تحفہ نے بارہ سال کی تپسیا بھنگ کر دی تھی۔ تحفہ کیا تھا آگ کا دہکتا ہوا انگارہ تھا۔ جو دل کے قریب ہی کہیں رکھ رکھا گیا تھا۔ اور اب اس کی تپش زندگی دوبھر کیے جا رہی تھی۔ زندگی اس کے لیے آسان ہی کب تھی اس نے ہمیشہ کڑی جھیلی .... ایک طرف قدرت کی مٹھیوں میں جکڑی اس کی تقدیر تھی اور دوسری طرف ایک سردارنی کی شیرنی جیسی ہمت، اس کا باپ ۴۷ء۱۹ کے فسادات میں خون کی ہولیوں کا شکار ہوا۔ اور اس کی ماں اپنی چار بچیوں سمیت لاہور سے ہندوستان کے رفیوجی کیمپ میں پناہ گزین ہوئی، ان دنوں اس کی سب سے بڑی بہن ۱۲ سال کی تھی، اور سب سے چھوٹی بہن تین سال کی۔ ان کا کوئی بھائی نہ تھا۔ بس لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اور ایک مرکھنا سا چچا رتن سنگھ جو نہ پہلے کبھی اسے اچھا لگا تھا۔ اور نہ اب۔ نہ اس نے کبھی شادی بیاہ کی نہ کسی اپنے پرائے سے ہی کوئی سنگت رکھی۔ بس وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتا گیا۔ اور اس کا باپ بھی اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر اسے نباہتا گیا۔ اس کی ماں سے اس کی کبھی نہ بنی۔ اس لیے کہ وہ بیٹھے بٹھائے ہی حکومت کیے جاتا تھا۔

آج کی لسّی کسی کام کی بنی رجنیت، مجھے تو تو چھاچھیوں والا دودھ ہی بھجوا دے (اس کی ماں کو وہ کبھی بھابی کہہ کر نہیں بلاتا، ہمیشہ نام ہی لیا کرتا تھا) اس کی ماں جل جاتی۔ لسّی تو تو ساری کی ساری ہی پی گیا۔ اوپر سے دودھ اور چھاچھیوں کی بھی فرمائش، کبھی یہ بھی دل چاہا ہے تیرا کہ تو دودھ بلونے میں میری مدد ہی کر دیتا۔ یا کبھی کبھار کے ساتھ کھیت کی کیاریاں جمانے میں ہاتھ بٹا دیتا۔

اس کی ماں بڑبڑاتی جاتی۔ مگر اسے دودھ ضرور بھجوا دیتی اور اب اسی مرکھنے سے چچا کے بازو میں نہ جانے کون سی طاقت سمٹ آئی تھی کہ وہ آدھی رات تک پاپڑ بیلتا رہتا۔ اور صبح سے ہی کنڈ ہیں بھر اسٹیشن پر ہر آنے جانے والی ٹرین کے مسافروں میں بیچا کرتا۔ شام کو جب تھکا ہارا واپس آتا تو سب کے سب پیسے رجنیت کور کو دے دیتا۔ اس کی ماں ایک ایک پیسہ گن کر اور سنبھال کر رکھتی۔ جس کا حساب اس کا مرکھنا سا چچا کبھی نہیں پوچھتا بس گھنٹہ دو گھنٹہ لیٹ کر اٹھتا تو پوچھتا بیسن منگا لیا تھا نا رجنیت؟ وہ ذرا تسلے میں ڈال دے۔ میں چلا پاپڑ بیلنے اسالی زندگی ہی پاپڑ بن گئی ہے۔

اس کی ماں اپنے میلے سے دوپٹے سے آنسو پونچھتی چپ چاپ بیسن تسلے میں ڈال کر باہر نکل جاتی۔ اپنی گائیں تو سب فساد کی نظر ہوئیں۔ پر رجنیت کور کے بازو میں ابھی طاقت تھی۔ سو اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اور جس جس گھر میں گائے نظر آئیں۔ وہ وہاں پہونچ گئی۔ گائے کی سیوا کرنے۔

”کتنی کٹوا دو گی مائی؟“

”دودھ دھلوا گے مالک؟“

اونچی اونچی دیواروں والے کام چور نوکر اکثر انہیں دغا دے جاتے تھے۔ سو یہ رجنیت کور ان کے لیے غنیمت ہو گئی۔ اور وہ رجنیت کور کے لیے، معاوضہ میں اس نے ہر گھر سے کیول ایک پاؤ دودھ ہی طلب کیا۔ اس طرح ڈیڑھ دو سیر دودھ وہ روزانہ گھر لے آتی۔ جس کا کبھی کبھار تھوڑا سا کھویا بنا کر اپنے دیور کے

سامنے رکھ دیتی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے کھویا اور بالائی کتنا پسند تھا۔ اور جواب ان چیزوں کے خواب سے بھی ڈرتا تھا۔

ایک دن بچیوں کے شور شرابے سے تنگ آکر رتن سنگھ نے سبھوں کو اسکول میں داخل کردیا۔ بڑی دو بہن ہائی اسکول میں داخل ہوئیں۔ اور چھوٹی قریب ہی کے میونسپل اسکول میں۔ ان سبھوں کی فیس معاف تھی۔ اس طرح ان کی پڑھائیوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اور ان کی قسمت سنورتی گئی۔ کئی سالوں بڑی دو بہنوں کی شادی ہوگئی۔ بہنوئی بہت اچھے ملے۔ ان کے بعد وہ خود تھی۔ اور اس نے اپنے متعلق ایک اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ شاید قسمت بھی کچھ ساتھ دے رہی تھی۔ جو آئی۔ ایس سی کرنے کے بعد اسے کسی طرح میڈیکل میں داخل گیا۔ اس کے داخلہ کی فیس اس کے بڑے بہنوئی نے ادا کر دی۔ مگر اس کے بعد.....؟

اس کے بعد تو اسے اسکالرشپ حاصل کرنا ہی تھا۔ میڈیکل کی پڑھائی کچھ مذاق تو نہ تھی۔ وہ اپنے بہنوئیوں پر بوجھ بننا نہ چاہتی تھی۔ اسے آئندہ کا کچھ کام کرنا ہی تھا۔ سو وہ دھواں دھار پڑھائی میں جٹ گئی۔ سارے کا سارا کورس اس نے رٹ لیا۔ پھر بھی نتیجہ نکلا تو اسکالرشپ ونود کے حصے میں آئی۔ دو چار نمبروں سے اس نے مس کیا۔ اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

ونود ایک رئیس باپ کا بیٹا تھا۔ ایک لمبی سی چمکیلی کار اسے چھوڑنے آتی تھی۔ اسکالرشپ کا روپیہ اس کے پاکٹ منی کا ایک مختصر سا حصہ بھی نہ ہوتا۔ مگر مدھولیکا کے لیے اس کی آئندہ پڑھائی کا دارومدار اسی پر تھا۔ پھر بھی اسکالرشپ ونود کے حصہ میں ہی آئی۔ وہ بے حد ذہین تھا اور مدھولیکا بیحد محنتی۔ ونود اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اور وہ ونود سے کھینچتی چلی گئی۔ ایک دن ونود نے اس سے بڑا بے چھوٹ سوال کر ڈالا۔

"مدھولیکا، تم مجھ سے ناراض ہو کیا؟ سبھوں سے تو تمہاری دوستی بنی

رہتی ہے۔ بس ایک میں ہوں کہ میری باتوں کا کبھی تو ڈھنگ سے جواب بھی نہیں دیتی۔

جانے کیوں اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے اور پھر وہ کچھ جواب دیئے بنا چل پڑی۔ اس کا ذہن صرف دو لفظوں کے گردوں میں الجھتا رہا۔ ونود اور اسکالرشپ۔

اسے کچھ دوسرا ہی راستہ ڈھونڈنا تھا۔ جلد ہی وہ اپنے سبھی ساتھیوں سے الگ تھلگ سی رہنے لگی۔ ادھر ادھر بے حد مصروف سی، اس نے کچھ بدنامیاں بھی مول لیں۔ لیکن پروفیسرس کے آگے پیچھے دوڑتی بھاگتی سی اس نے کچھ بدنامیاں بھی مول لیں، لیکن وہ اسکالرشپ اور ہر طرح کی مدد حاصل کرتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ڈاکٹر بن گئی۔ زندگی کا ایک حصہ ختم ہوگیا۔ اس نے کڑی جھیلی مگر جھیل ہی لی۔ اب وہ ایک ڈاکٹر تھی ڈاکٹر مدھولیکا۔ ہاؤس سرجن مدھولیکا ایک این سی۔ او کی بیوی مدھولیکا۔ شادی اس نے ماں کی مرضی پر اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کرلیا تھا۔ اس کا شوہر آرمی کا ایک NON COMMISSIAICD OFFICER تھا، اس کی ڈگریوں کے مقابلہ میں ایک نہایت معمولی نوکری پیشہ۔ لیکن بے حد سجیلا، اسمارٹ۔ مدھولیکا کے بازو سمجھا ہوا امرجیت سنگھ امربیل کی طرح اس پر چھاتا چلا گیا اور اپنی پوسٹنگ سے بھاگ بھاگ کر آتا اور اسے روپیہ کمانے کے نت نئے ڈھنگ بتاتا۔

مدھولیکا تم میرے بتائے ہوئے رستوں پر چلو پھر دیکھو تمہاری پریکٹس کیسی جمتی ہے۔ کوئی سالا تم سے آگے نہیں جا سکتا۔

لیکن امرجیت تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جو ہمارے پیشہ کے لیے مورل کرائم ہے۔ مجھے ایسے غلط کاموں کے لیے مجبور نہ کیا کرو۔

"ہش"، تم بھی جانے کس زمانے کی باتیں کرتی ہو۔ یہ یاد رکھنا کہ آجکل کا خدا روپیہ ہے، تم روپیہ حاصل کرو پھر خدا بن جاؤ گی۔

پھر وہ واقعی خدا بن گئی۔ لیکن ایسی خدا جس کی خدائی امرجیت سنگھ

کے ہاتھوں تھی۔

مدھولیکا، تم ذرا اپنے بالوں کو کٹوا لو، پھر دیکھنا تمہاری پرسنیلٹی کا کیسا رعب پڑتا ہے اچھی پریکٹس کے لیے ڈاکٹر کی پرسنیلٹی کا بہت ہونا ضروری ہے۔ جب تم اونچے کٹے بالوں پر بہترین سلک کی ساڑی پہن کر چمکتی ہوئی کار میں بیٹھو گی پھر دیکھنا کہ لوگ تمہیں کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

مدھولیکا نے حسرت سے اپنے ساون کے بادلوں جیسے گھنے بالوں کو دیکھا اور سوچا ٹھیک ہی ہے انہیں کٹوا ہی دیا جائے، اب اتنی فرصت بھی کہاں ہے کہ انہیں سنوار کر جوڑا بناتی رہوں۔ وہ دن تو کچھ اور ہی ہوا کرتے تھے جب بالوں کو پھولوں سے سجانے کا جی چاہتا تھا۔ پھر ان پھولوں سے گندھے بالوں کو دیکھنے والا بھی کوئی ہو۔

مدھولیکا کو بہت جلد معلوم ہو چکا تھا کہ امرجیت سنگھ کو اس سے نہیں، اس کی ڈگریوں سے محبت ہے۔ اس کے روپیہ کی چاہ ہے۔

کھٹ کھٹ وہ مشین بن کر روپیہ گڑھتی رہی اور امرجیت دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹورتا رہا۔ اپنی نوکری سے اس نے استعفیٰ دے دیا۔

ماں کو گوردوارہ جانے کے لیے روپیہ بھیجنا ہے۔ بھائیوں کی پڑھائی کے لیے DONATION دینا ہے۔ بہنوں کی شادی کا جہیز تیار کرنا ہے۔ روپیہ بھیجنا ہے، روپیہ دینا ہے۔

مدھولیکا روپیہ گڑھتی رہی۔ اور امرجیت مٹھیوں بھر بھر روپیہ بھیجتا رہا۔ کہ اپنے خاندان میں اس کی سربلندی کا ایک ہی راستہ تھا۔

بھابی سے کہنا بھیا مجھے ایک امریکن جارجٹ کی ساڑی بھجوا دیں۔ انہیں روپیہ کی کیا کمی ہے۔

چاچی سے کہنا چاچا، میرے لیے شلوار جمپر اور چینی کا ایک نیا شرٹ سلوا دیں۔

مامی سے کہنا ماما میرے لیے ......

اری بہو سے کہنا ذرا ....

فرمائشوں کے بنڈل آتے رہے، چیزوں کے بنڈل جاتے رہے۔ ایسے ہی وقت کے کسی نازک لمحہ میں بارہ سالوں بعد اسے اچانک ہی میڈیکل کالج کی سامنے والی سڑک پر ونود مل گیا۔ وہ قریب ہی کے ایک جنرل اسٹور سے تیل، صابن، بسکٹ، چائے اور کافی کے پیکٹ سنبھالتی ہوئی اپنی کار کے دروازے تک آئی ہی تھی کہ ایک چمکتی ہوئی کالی کار ٹھیک اس کے بازو آکر رکی اور ونود اتر پڑا۔

ہیلو، کیا ٹھاٹھ ہیں تمہارے مدھولیکا۔ مجھے پہچانا نہیں۔

"ہیلو، اچھے تو ہو۔ پہچانوں گی کیوں نہیں؟ اتنے دنوں کہاں تھے تم؟ کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ وہ بھی چہک اٹھی، پرانے ساتھی بہت دنوں بعد اگر مل جائیں تو ساری شکایتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ دل سے بہت قریب کچھ اپنے اپنے سے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اس کا دل آپ ہی آپ خوش ہو گیا۔

بمبئی میں تو میڈیکل کرنے کے بعد زیادہ تر فارن ہی رہا۔ کبھی انگلینڈ، کبھی امریکہ اور اب پورے بارہ برسوں کے بن باس کے بعد پھر اپنے دیش میں — اپنے شہر میں واپس آگیا ہوں۔ اور اب یہیں رہوں گا۔ میں بتاؤں تمہیں سب سے اچھی جگہ اپنا برتھ پلیس ہی ہوتا ہے۔ اپنے گروپ کے بہت سے ساتھیوں سے میں نے ملاقات بھی کیا۔ بس ایک تم ہی بچ رہی تھیں تم نے یہاں اپنا نرسنگ ہوم کھول لیا ہے نا؟ خوب ہی کیا۔ مجھے شاردا ملی تھی وہ کہہ رہی تھی کہ تم بہت اچھی جا رہی ہو۔

ونود ایک سانس میں بولتا چلا گیا۔

اچھا اب چلتا ہوں کل تمہارے گھر آؤں گا۔ لیکن ناراض تو نہیں ہو گی؟ مجھے اکثر تمہاری ناراضگی یاد آتی ہے۔

وہ بھی ہنستا ہوا، ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ وہ بھی جلدی سے اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ جانے کیوں پھر اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ جیسے اس نے آنکھوں

ہی ہیں سمیٹ لیا کہ وہ ہمیشہ ہی سے سمیٹ لینے کا فن جانتی تھی۔ اداسی دل میں دندناتی گھسی چلی آ رہی تھی اور اسے شدت سے اپنی تنہائی کا احساس ستانے لگا تھا۔ وقت بھی کتنا ظالم ہے جو لمحوں میں خوشی بخشتا اور چھینتا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح وہ کلینک چلی گئی۔ پھر وہاں سے نرسنگ ہوم پھر کلینک۔ بچے فون کرتے رہے وہ جواب دیتی رہی لیکن گھر نہیں آئی۔ ڈھلتی شام میں وہ تھکی ہاری واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ونود آیا تھا۔ اور شیفرس پن کا سٹ چھوڑ گیا ہے جو امریکہ سے اس کے لیے لایا تھا۔

اور اب اس ایک چھوٹے سے تحفہ نے اس کی تپسیا بھنگ کر دی تھی۔ تحفہ کیا تھا آگ کا دہکتا ہوا انگارہ تھا جو دل کے قریب ہی کہیں رکھ رکھا گیا تھا۔ اور جانے کیسے کیسے نقش دل پہ بنا گیا تھا یا کوئی داستان ہی لکھ چھوڑا تھا۔ آج تک تو اسے کسی نے ایک پھول بھی تحفہ میں نہیں دیا تھا۔ حد یہ کہ امر جیت نے بھی نہیں۔ اس نے تو صرف دینا ہی سیکھا تھا۔ لینا نہیں۔ پر ونود نے یہ کیا کیا؟ دیا بھی تو کیا درد دیا۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے

کھلے میدان میں بیچوں بیچ مکان میں جاڑے کی زرد دھوپ دریچہ سے ہوتی ہوئی صحن کی سیڑھیوں تک اتر آئی تھی۔ دُور تک کھلے میدان میں بے ترتیبی سے لگے چھوٹے بڑے درختوں کی زرد پتیاں زور زور سے ہل رہی تھیں۔ کچھ خشک پتیاں زمین پر اِدھر اُدھر بکھر رہی تھیں۔ ہوا میں ایک سوگوار سرسراہٹ تھی۔ مکان کے دائیں اور بائیں بازو جگہ جگہ گلاب کے پودے کچھ ادھ مرے سے زندہ تھے۔ زیادہ پودے پھولوں سے خالی تھے صرف ایک زرد گلاب تمام پودوں کے درمیان کھلا ہوا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ اس کی کئی پنکھڑیاں جھڑ کر زمین پر بکھر رہی تھیں۔

سائرہ احمد ڈھلتی ہوئی دھوپ کی روشنی میں نہائی ہوئی مکان کے برآمدے میں بیت کی کرسی پر نیم دراز، ادھ کھلی آنکھوں سے بکھرے ہوئے گلاب کو تک رہی تھیں۔ اُداسی دل میں دندناتی چلی آ رہی تھی اور خود کو سمیٹنے کی کوشش میں زیادہ ہی بکھرتی جا رہی تھیں۔ ویسے ہی دھڑ دھڑاتی ہوئی موٹر سائیکل آ کر گیٹ پر رُک گئی اور عجلت میں گیٹ کھولتے ہوئے پرویز داخل ہوئے۔ برآمدا پار کر کے وہ اندر چلے آئے۔ سائرہ احمد بھی پرویز کے پیچھے کمرے میں آئیں۔ پرویز نے ٹیبل پر سے

کچھ کاغذات سمیٹے اور کہا۔

"ماں! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ تم کھا لینا۔"

"کیوں.... کیوں پرویز! کیوں نہیں کھاؤ گے؟ میں کھانا لگا دیتی ہوں تم کھا لو۔"

"نہیں ماں دیر ہو جائے گی۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ شام کو بھی واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ تم گھبرانا نہیں۔ میں بھیا کو کہتا جاؤں گا کہ بھابی کو تمہارے پاس بھیج دیں۔"

پرویز نے باہر آ کر گھر سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور چل دیئے سائرہ خالی نظروں سے پرویز کو جاتے دیکھتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ زینہ سے نیچے اتر کر میدان میں ایک طرف گئے ہوئے نل سے ایک مگ میں پانی نکال کر گلاب کی کیاریوں میں ڈالنے لگیں۔ ایک بجھی بجھی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر عیاں تھی۔ نہ جانے اتنے ڈھیر سے دن کیسے بیت گئے تھے۔ انھیں تو اب بھی انہی دنوں کی تباہ کاریاں یاد آتی تھیں جب لو سے جھلستی دوپہر میں وہ اپنی چچا زاد پھوپھی زاد بہن بھائیوں کے ساتھ آم کے باغیچے میں فراک پہنے ننگے پیروں کیریاں چنتی اور کھٹ مٹھی بیر کی جھاڑیوں تلے گرے ہوئے بیروں کو چن کر مولوی صاحب کا دیا ہوا حساب جوڑنے کی کوشش کرتی تھی۔

"تین بیر رام کے پانچ رحیم کے، کل کتنے ہوئے؟"

کتنے ہی ہوتے اس سے کیا.... رام کے تو تین ہی ملے اس کا دل بغاوت کر جاتا۔ مولوی صاحب کا دیا ہوا حساب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا بلکہ مولوی صاحب کا کوئی بھی سبق اسے اچھا نہیں لگتا تھا اور دادی امّاں کے بردوان والی حویلی کی بھی بہت سی باتیں اسے بالکل پسند نہیں تھیں۔ سوائے حویلی سے لگے ان تالاب کی مچھلیوں کے جو ہر تین چار دنوں بعد جال ڈال کر نکالی جاتیں اور ضرورت کے تحت رکھ کر دو چار بڑی بڑی مچھلیاں رسّی سے باندھ کر اسی تالاب میں چھوڑ دی جاتیں اور دوسرے

تیسرے دن بُوا جا کر رسی سے بندھی مچھلی کو کھینچ لاتی اور سبھوں کے لیے سالن تیار کرتی۔ لیکن وہ ان تمام ناپسندیدہ باتوں سے سمجھوتہ کرنا سیکھ رہی تھی کہ شاید یہی اس کی فطرت تھی۔ اسے حویلی کی ایک اور بات سخت ناگوار تھی وہ یہ کہ یہاں کے تمام لڑکوں کے لیے تو ایک بڑے ٹھاٹھ باٹ والے ماسٹر آتے تھے۔ پینٹ شرٹ پہنے، بڑے چچا کی فیٹن پر بیٹھ کر ایک ہاتھ میں چھڑی تھامے شان سے اُتر کر گول کمرے میں بیٹھ جاتے پھر چچا، پھوپھا، ماموں۔ کے سبھی بیٹے ایک ساتھ ماسٹر صاحب کے پاس کتابیں لے کر آتے اور جانے کتنی دیر تک پڑھتے رہتے۔ دوسری طرف وہ تھی بہنوں میں سب سے چھوٹی لیکن سب سے بد دماغ اسے اپنی بہنوں کے ساتھ آنگن سے لگے ہوئے ایک کھپریل کے برآمدے میں مولوی صاحب سبق دیتے۔

"ب نے ایک نکتہ چرا کر نیچے رکھا، ت، نے اپنے پیٹ میں دو نکتہ چھپالیا"۔
ویسے ہی وہ اٹھتی اور بھاگ کر آنگن میں دادی اماں کے پاس شکایت کرتی میں اس مولوی صاحب سے نہیں پڑھوں گی دادی اماں! یہ تو چوری سکھاتے ہیں۔

"دھمادھم۔ دھمادھم"۔ اس کی پیٹھ پر دو چار گھونسے پڑتے۔

زلیخا باجی اسے اتنی لمبی زبان نکالے گھورتی۔

"السلام علیکم، امیّ جان! کیسی ہیں آپ"۔

سائرہ احمد گلاب کی کیاریوں میں پانی دیتے دیتے رُک گئیں دیکھا تو رشیدہ رکشا سے اُتر کر ان کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔

"مامی! تومی بھالو اچھو تو؟" بڑی شفقت سے انھیں دونوں ہاتھ میں تھام کر وہ ہندی بنگلہ ملی زبان میں بولی۔

"اپنی کہو، بہت دن بعد آئی ہو۔ میں تو روز ہی تمہیں یاد کر رہی تھی"۔

سائرہ احمد مسکراتے ہوئے بولیں۔

"مامی! آمی کولکاتائی چھیلم۔ کال کے ائی ایشے چھی۔ زینو بی! بی اے پاس کو دے گچھے"۔

"پورشوں میلاد ہو بے۔ تو ری کے آستے ہو بے"۔

رشیدہ سائرہ احمد سے میلاد میں آنے کا وعدہ لے کر چلی گئی تو وہ پھر پودوں کی طرف پلٹیں۔ کیاریوں میں دُوب اُگ آئی تھی۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جھک کر ہری ہری دُوب اکھاڑنے لگیں۔ کچھ دن قبل تک وہ اور احمد صاحب دونوں مل کر ان کیاریوں میں پانی دیتے اور صفائی کرتے تھے۔ لیکن یہ اچانک ہی احمد صاحب کو کیا ہوا کہ اسے تنہا چھوڑ کر چل بسے اور وہ ہاتھ ملتی رہ گئی۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ابھی تو اس نے مولوی صاحب کا آموختہ بھی نہیں دوہرایا تھا کہ اس کے دروازے پر بارات آگئی تھی اور وہ روتی دھوتی اپنے بزرگوں کی دُعاؤں کے سایہ میں کسی اجنبی کے ساتھ اجنبی راہوں پر چل پڑی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے رضی احمد کی طرف دیکھا ایکدم جگ جگ کرتا گبرو نوجوان اس کے ساتھ تھا وہ چونک پڑی جیسے خواب سے جاگ گئی ہو۔ رضی احمد خوابوں میں بسنے والے نوجوان تو ہو سکتے تھے لیکن حقیقت میں بھی ساتھ ہوں سائرہ اس کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے بڑی گمبھیرتا سے سوچا کہ کیا وہ رضی احمد کے لائق بھی ہے؟ کیا وہ ان کا ساتھ بھی دے سکے گی یا رضی احمد اسے خوشدلی سے قبول کرلیں گے؟ لیکن زندگی اتنی تیز رفتار تھی کہ اُسے ان سوالوں میں الجھنے کا وقت ملا نہ موقع اور اسے اپنی ساس کی ایک چھوٹی سی بات یاد رہ گئی۔

ایک دن جب وہ اپنی ساس کے ساتھ رسوئی میں بیٹھی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی تو اس نے ذرا تکلف سے ایک چپاتی اور تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں نکال لیا۔ ویسے ہی ساس اماں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور سنجیدگی سے کہا۔

"بہو! ایک بات یاد رکھنا۔ اگر صحت اچھی نہ رہے تو اپنا شوہر بھی نہیں پوچھتا اور رضی احمد سے اپنا سارا حق وصول لینا تمہارا کام ہے"۔

اس نے اسّی سالہ مضبوط کاٹھی کی اس بیوہ عورت کو دیکھا جس سے وہ بہت ڈرتی تھی لیکن فی الحال وہ اسے بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر رضی احمد کے ساتھ

وقت کے دھارے میں وہ بہہ چلی۔ اس نے منٹ بھر کے لیے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا جہاں وہ جذباتوں سے بھری ایک پوری دُنیا چھوڑ آئی تھی۔ سب اپنے سگے پرائے ہو گئے تھے اپنے گھر سنسار میں وہ سب کچھ بھول گئی اور رضی احمد بھی اسے اپنی شفقتوں کے سائے میں اور کبھی اپنی برہمی کے ساگر میں لیے تیرتے رہے۔ انھوں نے اسے کبھی بھی بہت تنہا نہیں چھوڑا اور سائرہ کو بھی اپنی ساس کی تنبیہہ ہمیشہ یاد رہی۔ لیکن اس نے رضی احمد سے اپنا سارا کا سارا حق وصول کیا یا نہیں اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ رضی احمد اس سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ اسے ہمیشہ سجا بنا اور خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ خوش گفتار اور خوش مذاق ایسے کہ ایک زمانہ ان کا گرویدہ تھا۔

رضی احمد یونیورسٹی کے اچھے ٹیچر اور بہترین اسپورٹس مین تھے۔ اس لیے سائرہ کا بھی اکثر وقت کھیل کے میدان میں گزرتا۔ اس نے ہر اس مشغلہ میں دلچسپی پیدا کر لی تھی جو رضی احمد کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ رضی احمد کے بچوں کی پرورش سے لے کر ان کے دوست احباب رشتہ دار، شاگرد اور سبھی چاہنے والوں کی خاطر مدارتیں شادی بیاہ، رسم و رسوم میں وہ اس طرح گم ہو گئی کہ نہ اُسے اپنا دن یاد رہا اور نہ اپنی راتیں۔ وہ اپنا آپ ہی کھو بیٹھی مگر کبھی کبھی اسے ایک خلش سی محسوس ہوتی تو بھی وہ اسے ایسے ہی ٹوٹ کر چاہتے۔ ان کا تو کام ہی محبت کئے جانا تھا جیسے.... جیسے رضی احمد کوئی ایک شخص نہیں بہ یک وقت بہت سے دل اور بہت سی شخصیت کے مالک ہوں۔ تو پھر اس کے حصے میں کیا آیا؟

کبھی وہ رضی احمد سے ناراض بھی ہو جاتی۔

"میں پوچھتی ہوں آخر آپ کے پاس میرے لیے بھی کوئی وقت ہے؟ محبت تو آپ اپنے دشمنوں سے بھی کر لیتے ہیں پھر مجھے چاہا تو کون سا احسان کر ڈالا"۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟" رضی احمد عاجز سے ہو جاتے۔

"میں...... میں چاہتی ہوں کہ آپ سارے کے سارے میرے ہوں اتنے ڈھیر

سارے لوگوں کے نہیں"۔

"بھئی یہ ٹکڑے پارچہ میں بانٹنے والی عادت تمہاری ہوگی۔ میری تو نہیں"۔

"میں پوچھتی ہوں آپ اپنے سارے ملنے جلنے والوں کو بہت زیادہ نہیں چاہتے ہیں، کیا؟"

"چاہتا ہوں.... چاہتا ہوں.... لیکن تمہارا مقام تو سبھوں سے بلند ہے۔ تم اپنا مقابلہ سبھوں سے کرتی ہی کیوں ہو؟

ثمائرہ! دل کی بلندی حاصل کرو اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں خود کو برباد نہ کرو"۔ رضی احمد نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے باہر چلے جاتے اور جس طرح بچپن کی بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں نہ کبھی نہیں سمجھ پاتی۔

پھر ایسا ہوا کہ ان کی من چاہی بات آپ ہی آپ خدا نے پوری کر دی۔ لڑکے بڑے ہو گئے۔ ان کی شادیاں ہو گئیں۔ سبھوں نے علیحدہ گھر بسا لیا۔ کچھ تو شہر سے باہر چلے گئے۔ صرف چھوٹا والا پرویز، رضی احمد اور سائرہ کے شامل رہ گیا۔ رضی احمد خود بھی ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اب ان کے گرد سے لوگوں کا جمگھٹ چھٹنے لگا تھا اور کم ہوتے ہوتے صرف چند بے غرض دوست تک محدود رہ گیا تھا۔ انھوں نے کیمپس کا مکان چھوڑ دیا تھا اور اپنے بنوائے ہوئے مکان میں آ کر رہنے لگے تھے۔ مکان کچھ ادھورا تھا لیکن چاروں طرف بڑا کمپاؤنڈ تھا۔ جس میں رضی احمد اور سائرہ ہر طرح کے پھل پھول لگاتے اور ان کی دیکھ بھال میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ یا کبھی سائرہ بڑے شوق سے حلوے اور خوش ذائقہ کھانے پکاتی جو اکثر اس کی ساس نے یہ کہہ کر سکھایا تھا کہ رضی احمد اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں لیکن سروس کے دوران تو وہ ایسی جلد بازی میں رہتے تھے کہ کبھی اطمینان سے کھانا ہی نہیں کھایا۔ وہ سب کے سب حلوے اور پراٹھے دوستوں کو کھلا دیتے تھے لیکن اب وہی حلوے وہ شوق سے کھاتے۔ رضی احمد اب مکمل طور پہ سائرہ کے تھے اور سائرہ بھی اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش۔

اب وہ جب بھی بازار جانے کو تیار ہوتیں تو رضی احمد سوال شروع کر دیتے کتنی دیر میں آؤ گی؟ جلدی آجانا میں گھڑی دیکھ رہا ہوں۔

سائرہ ہنس کر کہتیں۔

"ساری زندگی گزار کر اب آئے ہیں راہ راست پر۔ بہرحال دیر آید۔ درست آید۔ یہی تو میں چاہتی تھی۔"

لیکن شاید دشمنوں کے کان بھرے تھے جو عید کے دوسرے ہی دن جب ان کا گھر بیٹے بہوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ رضی احمد تمتماتا چہرہ لیے واپس آئے اور چڑھ کر بولے۔ "مجھے جان کر ہی ستانے کو چلے آتے ہیں یہ۔ میں نے کہہ دیا کہ راشدہ اور انوار کے خلاف میرے سامنے کچھ نہ کہا کرو وہ جیسے بھی ہیں میرے بہت عزیز ہیں لیکن انھیں برا کہتے تو لوگوں کا دل ہی نہیں بھرتا۔ جب سے انوار سینٹرل سروس میں گئے ہیں تب سے لوگوں کا یہی حال ہے۔"

بات چھوٹی سی تھی گزر گئی۔ لیکن گزری کہاں۔ آدھی رات ہی سے رضی احمد کی طبیعت خراب ہوتی گئی۔ اور سات بجے صبح تک دل دھڑک دھڑک کر خاموش ہو گیا۔

سائرہ احمد سکتے کے عالم میں تھیں اور خالی خالی نظروں سے سارے جہاں کی حسرت لیے گھر کے اجڑنے کا ہنگامہ دیکھ رہی تھیں۔ رضی احمد بہت ہر دل عزیز تھے اس لیے بہت کہرام مچا، بے پناہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا یہ ماتم کدہ آہستہ آہستہ ماضی کی داستان بن گیا اور سائرہ نے اس اجاڑ ویرانے میں گلاب کے پودوں میں پانی ڈالتے ہوئے سوچا۔ رضی احمد! تم جو سبھوں کے لیے اتنے اپنے تھے میرے لیے شاید بہت تھوڑے۔ بہت مختصر!!

زیر لب

اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی سانس نیچے۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں
رفعت نے آہستہ سے اپنی جوائننگ رپورٹ ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف بڑھا دی
اور دزدیدہ نظروں سے ان کے سراپا پہ نظر ڈالی۔ سانولے سلونے، کسی حد تک اسمارٹ،
پینٹ شرٹ کوٹ پہنے، ٹائی باندھے، بھلے مانس ہی تو تھے۔ ایسے ہی ہوتے ہیں
مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر۔ رفعت نے دل میں سوچا۔

پالش اڑے ہوئے ٹیبل پر سامنے اس کی جوائننگ رپورٹ رکھتے ہوئے ہیڈ
ماسٹر فیاض احمد صاحب نے پوچھا۔

"آپ بچوں کو پڑھا سکیں گی نا؟"

اور کنکھیوں سے رفعت کو دیکھنے لگے۔

کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، پشت پر پڑی ہوئی ڈھیلی ڈھالی
چوٹی، دھان پان سی نازک لڑکی، بڑی نفاست سے پہنی ہوئی ساڑی میں لپٹی لپٹائی
ان کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ کل ہی تو وہ اپنے ساتھ کام کرنے والے اساتذہ سے کہہ
رہے تھے کہ ڈی ایم صاحب کی بہن اور جناب رشید الزماں صاحب کی بیٹی اس اسکول

کو جوائن کرنے والی ہیں۔ ان کا تقرر اسی اسکول میں ہو گیا ہے۔ اب بھلا یہاں ان کا دل تو کیا لگے گا لیکن کسی طرح ہمیں ہی ان کو لے کر چلنا ہے۔ تعجب ہے کہ وہ بھلا مڈل اسکول میں نوکری کرنے کیوں آ رہی ہیں۔

"جی! میں کوشش کروں گی کہ پڑھا سکوں۔" رفعت نے مختصر سا جواب دیا۔

بازو کے کمرے سے بچوں کے زور زور سے پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"آٹھ اٹھے چونسٹھ۔ آٹھ نواں بہتر۔"

شہر کے گنجان محلے میں کئی کئی غلیظ گلیوں کو پار کر کے یہ سفید بوسیدہ سی عمارت گلی کے آخری نکڑ پر ایستادہ تھی۔ اس کی دیواروں کا پلاسٹر جھڑ رہا تھا۔ گلیوں کے دائیں بائیں گوشت اور سبزی کی دوکانیں تھیں جن کی چھتوں پر چیل اور کوے منڈلاتے تھے نیچے گندی نالیاں بہتی تھیں اور اوپر مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور گوشت بیچنے والوں کا ٹھٹھا۔ کچھ عجیب گندہ سا ماحول تھا یہاں کا۔ رفعت دل پکڑ کر دبیز قالین بچھے ہوتے ڈرائنگ روم والے گھر سے نکلتی جہاں عشق پیچاں اور منی پلانٹ کی لٹیں لہراتی تھیں، تو اسکول کو جانے والے راستے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے۔

انھیں پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اور ان پتھروں پہ چلتے چلتے تو اس کے پیر کب کے لہولہان ہو چکے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ راستہ اس اسکول کا نہیں اس کے شوہر کے گھر کا راستہ تھا۔۔۔۔۔ اس کی اپنی سسرال کا راستہ۔۔۔۔۔

بارہ سال قبل کسی سعد ساعت کی مقررہ تاریخ میں اس کی زندگی پر نحوستوں کا سایہ لہرا گیا۔ اس کے دروازے بارات بجی تو بازو کے مکان سے ایک جنازہ نکل پڑا۔ بارات میں بجتی شہنائیاں اور بینڈ باجے ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئے۔ منجمد۔ خاموش۔ اور پھر وہی دھماکہ خیز شور و ہنگامہ۔ وہی بینڈ باجے اور شہنائیوں کی چیخ و پکار۔۔۔۔۔ لیکن اس کی قسمت تو اسی ایک پل میں ساکت ہو گئی تھی۔ منجمد۔ جلد ہی

انکشاف ہو گیا کہ اس کا شوہر پاگل ہے۔ پھر وہی ہوا جو کسی پاگل سے بیاہی جانے
والی لڑکی کا حشر ممکن تھا۔ یعنی لوگوں کی چہ می گوئیاں۔ دبے دبے لہجے میں سوالات
کی بوچھاڑ۔ اور طویل ہمدردیوں کا ایک نہ ختم ہوتے والا سلسلہ۔ ہمدردیوں کے
اس طوفان میں اس کی انفرادیت گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی خودداری دم توڑ گئی۔ لیکن
کتنی نفرت تھی اسے لوگوں کے اس ہمدردانہ رویّہ سے۔ اور کتنی آسان تھی یہ خیرات
اوروں کے لیے۔ وہ بھاگتے اپنے کمرے میں محصور ہو گئی۔ سمٹتے سمٹتے اپنے پلنگ پر مرکوز
ہو گئی۔ اسے آدمیوں کے اس جنگل سے ڈر لگتا تھا۔ اس کا وجود اس کا اپنا وجود کتنا
کمتر، کتنا ننھی سا محسوس ہوتا تھا اسے۔ اس کی نفسیات بُری طرح گھائل تھی۔ والدین
بھائی بہنیں سب اسے دیکھ دیکھ کڑھتے۔ اتنے بھرے پُرے گھر میں سبھی خوش و خرّم
تھے سوائے رفعت کے۔ رشید الزماں صاحب کے تمام کرّ و فر کے باوجود اس کی
گھُن لگی قسمت نہ سنوری۔ بڑے سوچ وچار کے بعد بھائیوں نے رفعت کو اسکول
جانے پر مجبور کیا۔

"کیا مضائقہ ہے رفعت تم اسکول چلی جایا کرو۔ کچھ وقت ہی کٹ جائے گا
اور بچوں کے ساتھ رہو گی تو دل بھی بہل جائے گا۔"

"دل تو بہت بہل چکا بھیّا۔ اور اب تو دل کہیں لگتا ہی نہیں"۔ اس نے دل
کی باتوں کو زیر لب آنے نہ دیا اور بولی۔

"جی ہاں! چلی جاؤں گی۔"

رشید الزماں صاحب کے اثر و رسوخ کے صدقے رفعت کو گھر کے قریب ہی
ایک مڈل اسکول میں جگہ مل گئی۔ اس دن سے رفعت روز اس گندے راستے پر سنبھل
سنبھل کر پیر رکھتی۔ اسکول جانے والے راستے سے گزرتی تو محلّے کے چھوٹے چھوٹے لڑکے
اور لڑکیاں اپنی اپنی کتابیں سنبھال اس کے ساتھ ہو لیتے۔ کتنے ہی دوسرے اسکول کو
جانے والے بچوں نے اپنا تبادلہ رفعت کے اسکول کروالیا۔ فیاض احمد صاحب بھی
مشہور ہیڈ ماسٹر تھے اور جب کوئی اسکول زیادہ پست حالت میں ہوتا تو اسے

سنبھالنے کے لیے فیاض صاحب کو بھیج دیا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسکول میں بچوں کی تعداد دوگنی ہوگئی۔ اسکول کی اونگھتی زندگی میں جیسے بہار آگئی۔ رفعت اسکول نہ پہنچی گویا کائیوں بھرے تالاب میں کنول کا پھول کھلا۔ بچے گھروں کو بھاگنے کے بجائے لہک لہک کر اپنا سبق یاد کرتے۔

"باجی! میں سناؤں۔ باجی میں بتاؤں؟" ان کے ہاتھ اوپر اٹھے ہی رہتے۔

"آپ اتنی کلاسیں کیوں لیتی ہیں؟ کبھی آرام بھی کر لیا کیجیے۔" تھکن سے چور کوئی ماسٹر امجد صاحب اسے مشورہ دیتے۔

"مجھے حرام کے پیسے نہیں لینے۔ میں تو پورے کلاس لوں گی۔" رفعت اپنے سر کو جھٹک دیتی۔

"اچھا! چائے آگئی ہے۔ یہ چائے تو پی لو۔" اس کی دوست سہیلہ اسے چائے کی پیالی تھما دیتی۔ ادھیڑ عمر کے ماسٹر امجد دل ہی دل میں کچھ شرمندہ سے اپنی جاتی ہوئی توانائی کو سمیٹ خود بھی کلاس لینے میں جٹ جاتے۔

"ساڑھے دس سے زیادہ ہو گئے آج بچے لائن کیوں نہیں لگاتے۔ مناجات کیوں نہیں ہوتی؟"

"رضوان اور منّی! جلدی لائن برابر کرو اور مناجات شروع کروادو۔"

"آج مناجات نہیں ہوگی ماسٹر صاحب! سبھوں نے دیر کر دی ہے۔"

"میں تو باجی کے کلاس میں جاتا ہوں۔"

"مناجات کے بغیر کلاس میں مت جاؤ۔"

"نہیں ماٹ صاب! باجی کلاس میں ہیں...."

"بھئی! آپ بچوں کو دیکھتی نہیں۔ یہ کیسے ضد کر رہے ہیں؟" ماسٹر صاحب رفعت کے پاس آگئے۔

"آپ سب لوگ دیر سے کیوں آتے ہیں آخر؟ خوامخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔" وہ اکتاتے لہجے میں بولی اور گردن کو ہلکے سے خم دے کر بچوں کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری"

بچے اور بچیاں بھاگ بھاگ کر مناجات گانے لگے۔

"غضب کا اثر ہے آپ کی باتوں میں بھی۔ یہ آپ کون سا جادو کر دیتی ہیں؟"
نسیم صاحب پاس آکر کہتے۔

"ایک گذارش ہے آپ سے! عید کے دن قریب ہیں۔ میری بچی کا ایک فراک نہیں سی دیں گی؟"

"ضرور ضرور! کیوں نہیں۔" رفعت خوش دلی سے کہتی۔

"میری بہن آپ سے ملنا چاہتی ہے وہ کچھ کٹنگ سیکھے گی۔ بتا دیں گی نا آپ اس کو؟"

"کیوں نہیں!"

"میرے بیٹے کا ایک سوئیٹر بنا دیں گی آپ؟"

"بنا دوں گی۔"

"آپ میرا ہی ایک سوئیٹر بن دیجئے نا۔ دیکھئے کیسی ٹھنڈ ہے اور میں بغیر گرم کپڑے کے کیسی سردی کھاتا ہوں۔"

نسیم صاحب نے رفعت سے سوئیٹر بنوا کر پہن لیا اور اسکول ایسے آئے گویا کوئی معرکہ فتح کر کے آئے ہوں۔ دوسرے اساتذہ خاموش ٹھنڈی نظروں سے سوئیٹر کو تکتے اور لمبی لمبی سانسیں کھینچ کر خود کو کلاسز میں زیادہ سے زیادہ مشغول رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ رفعت کو اسکول کا ماحول عجیب سا لگا۔ کچھ کھنچا کھنچا۔ کچھ کشیدہ سا۔

وہ سہیلہ کے ساتھ بیٹھی اداس ہوتی رہی۔

"رفعت دیکھو! تم وقت بے وقت ایسی اداس نہ ہوا کرو۔"

"دیکھتی نہیں۔ سبھوں کے کام کر دیا کرتی ہوں پھر بھی انھیں جانے کیا ہو جاتا ہے یہ۔" رفعت روہانسی ہو جاتی۔

"دماغ خراب ہے ان لوگوں کا۔" سہیلہ چڑھ کر کہتی۔ "چلو آج فیاض صاحب سے کہہ کر چھٹی لے لیں۔"

"ہاں! اِدھر اُدھر گھوم آئیں گے۔"

رفعت اپنی کالی شال کو جسم پر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے فیاض صاحب کے پاس پہنچی۔

"آج مجھے اور سہیلہ کو فرصت دیدیجئے۔ کچھ کام ہے۔"

"آپ دونوں ایک ساتھ ہی چلی جائیں گی؟"

"جی ہاں! کام ہی کچھ ایسا ہے۔" رفعت صاف جھوٹ بول گئی۔

"سہیلہ چلی جائیں۔ رفعت کی چھٹی نہیں ہے..." دل کی باتوں کو زیرِ لب آنے سے روکتے ہوئے فیاض صاحب نے کہا۔

"جس حال بھی آپ خوش رہیں۔ ہم لوگ تو ہمیشہ آپ لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"عنایت ہے آپ کی۔" سہیلہ نے برجستہ کہا۔

"نہیں رفعت! کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ خواہ مخواہ ہی اداس ہو جاتی ہیں۔"

یہ خواہ مخواہ کی بھی اچھی رہی۔ آپ کیا جانیں کہ درد کیا ہے۔ رفعت تمالی نظروں سے انھیں تکتی، دل کی باتوں کو دل ہی میں پیتی آہستہ سے کھسک گئی۔

مہینوں بیت گئے۔ رفعت کا موڈ ایک دم خراب تھا۔

"یہ جانے کیوں فیاض صاحب اسکول کے سارے جھمیلے میرے سر ڈال دیتے ہیں۔" غصّہ سے اس نے کاپی اٹھا کر پھینک دی۔

"حساب پورا نہیں ہوتا۔ اٹھائیس روپے ستّر پیسے گھٹتے ہی ہیں۔"

"لائیے میں دیکھوں حساب!" نعیم صاحب نے کاپی اس کے سامنے سے اٹھائی۔

پھر سبھوں نے باری باری حساب دیکھ ڈالا" کوئی فائدہ نہیں۔ روپے گھٹتے ہی

ہیں۔ اب آپ ایسا کریں کہ کچھ خرچ ہی اسکول کا دکھا دیجئے۔ چاک رجسٹر وغیرہ کی رسید میں لا دوں گا۔" کسی نے مشورہ دیا۔

"مجھے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں روپے دیدوں گی۔" رفعت چڑھ کر بولی۔

سہیلہ کلاس لے رہی تھی۔ رفعت نعیم صاحب کے پاس ہی بیٹھی باتیں کئے گئی۔

دوسرے دن پھر وہی کشیدگی۔ کھنچا کھنچا سا ماحول...... خود کو لیے دیئے رہنے کی کوشش میں اساتذہ زیادہ سے زیادہ کلاس میں مشغول رہے۔ یا ایک دوسرے پر طنز کے نشتر پھینکتے رہے۔ رفعت بوکھلا گئی...... سہم کر ان کے موڈ کا اندازہ کیا اور گہری سوچ میں تنہا ڈوبی فیاض صاحب کے پاس بیٹھی رجسٹر ورک کرتی رہی۔ رفعت کے چہرے پر اُداسی کے سائے لہراتے دیکھ کر فیاض صاحب نے کہا۔

"آپ اتنی اداس کیوں رہتی ہیں آخر؟"

"اس لیے کہ زندگی نے کاٹ کھایا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

ایک کرب کی لکیر فیاض صاحب کے چہرے پر ابھر کر ڈوب گئی۔

"زندگی کوئی ڈس لینے والا ناگ نہیں۔ یہ ایک توانائی ہے ایک طاقت۔"

"جی ہاں! ضرور ضرور۔" رفعت نے ہنس کر کہا۔ "یا یوں کہیے کہ ایک سیل حوادث لیکن ایک شعر سن لیجئے!

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی طلاطم۔ تری زندگی کنارا"

فیاض صاحب بوکھلا کر چپ ہو گئے۔ رفعت کہتی رہی۔

"آپ کیا جانیں زندگی کس بلا کا نام ہے۔ طوفان کا نظارہ کرنے والے اس کی تباہیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر حوصلہ ہو تو ڈوب کر دیکھئے کہ طوفان کسے کہتے ہیں۔"

"طوفان میں ڈوبنے والے ڈوب ہی جاتے ہیں۔ پھر نہیں اُبھرتے۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ ریت اور بالوؤں پر ڈوبنے والوں کو دیکھا ہے کبھی؟"

فیاض صاحب نے کچھ سنجیدگی سے کہا۔ رفعت چپ ہو گئی۔ فیاض صاحب کے چہرے پر درد کی سلوٹیں تھیں۔ وہ اسکول کے رجسٹر میں گم ہو گئے۔ رجسٹر دونوں کے درمیان ایک بہترین فرار تھا۔

اس رات رفعت سو نہ سکی۔ فیاض صاحب کے بے معنی جملے اس کے ذہن میں گونجتے رہے۔ دھواں دھواں سے الفاظ کو وہ خواہ مخواہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذہن عجیب سے تصورات کے جال میں الجھا تھا اور جب وہ ان تصورات کو پرے ڈھکیل کر سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیتی تو فیاض صاحب کے چہرے کی کربناک تحریریں اس کے کانوں میں کچھ اور ہی سرگوشیاں کرنے لگتیں۔ پھر اسکول کے ایک ایک استاد اسے یاد آئے۔ نعیم صاحب، امجد صاحب، نسیم صاحب، حیدر اور شبیر صاحب۔ سبھوں کے ساتھ اس کے تعلقات کتنے اچھے اور تعاون سے بھرپور تھے۔ دن رات سب مل کر اسکول کے لیے نئی نئی اسکیمیں سوچتے۔ فیاض صاحب سے مشورہ کرتے اور رفعت اور سہیلہ دونوں اپنی محنت سے اسے ایک نئی جلا دیتیں۔ کتنی ہم آہنگی تھی ان کے درمیان۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ کیا ہوتا جا رہا تھا انھیں؟ رفعت کچھ دیر بھی کسی سے باتیں کر لیتی تو دوسروں کا منہ پھول جاتا۔ وہ ایک دوسرے سے کشیدہ اور برہم نظر آتے۔ اچھا بھلا ماحول چوپٹ ہو جاتا۔ رفعت بوکھلا کر فیاض صاحب کے پاس کاموں میں مصروف ہو جاتی اور دل ہی دل میں ڈرتی رہتی۔

اُدھر سہیلہ تھی کہ اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ جب جی چاہتا گھنٹوں گپیں ہانکتی یا کلاس میں مصروف رہتی۔ نہ اس کی محنت کو کوئی سراہنے جاتا۔ نہ اس کی توجہ پر دوسرے ناراض ہی ہوتے۔ آخر یہ تمام عنایتیں مجھ پر ہی کیوں؟ رفعت کو نیند نہیں آ رہی تھی... فیاض صاحب کی سنجیدگی نے کئی افسانے ایک ساتھ الجھا دیئے تھے یہ کیا ہوتا جا رہا ہے انھیں یا کیا ہوتا جا رہا ہے مجھے۔ ان دنوں وہ بھی تو فیاض صاحب کی کارکردگی کی حد سے زیادہ قائل ہو گئی تھی۔ اسکول کے کاموں میں ایک سرور کی کیفیت تھی۔ وہ ایسا دل و جان سے اسکول کے کاموں میں جٹی تھی گویا اس کی زندگی کا مقصد تو اب اس

اسکول اور اسکول کے بچوں کے سوا کچھ اور نہیں۔ حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اسکول کو جانے والے غلیظ راستے جن پر کبھی وہ بڑی کراہت سے سنبھل سنبھل کر پیر رکھتی تھی۔ اب اپنی سفید سینڈل اور نفیس ساڑی کا خیال کئے بغیر ہی کوڑوں کے ڈھیر پر سے تیز تیز گزر جاتی۔ اس کے ساتھ بچوں کی ایک فوج خوشی سے اچھلتی کودتی ساتھ ہو لیتی۔

"تم ہی تو میری زندگی ہو تم ہی میری خوشیاں۔ تمہارے سکھ میں میں اپنا دُکھ بھول گئی۔" رفعت انھیں دیکھ کر مسکراتی۔ لمحے گزرتے گئے۔ رفعت چلتی رہی انہی جانے پہچانے راستوں پر۔ لیکن ان دنوں فیاض صاحب کی دھیمی دھیمی نظروں میں وہ خود کو تحلیل ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ اسے جانے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور ذہن بوجھل تھا۔ وہ ایک ہفتے سے متواتر جاگ رہی تھی۔ اسے کچھ بہت ٹھیک سے یاد نہیں آرہا تھا۔ مگر شاید وہ گیمس ہی کا پیریڈ تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ رفعت ہیلہ اور نعیم صاحب فیاض صاحب کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ دوران گفتگو نعیم صاحب کی کسی بات کے جواب میں رفعت نے کہا ؏

"اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل

نعیم صاحب! آپ ہر کام جذبات کی رو میں بہہ کر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں۔ ذرا عقل سے بھی واسطہ رکھیئے۔"

"عقل سے واسطہ رکھنے والے بھی تو کبھی دل کی بات سن ہی لیتے ہیں۔ اس کا دوسرا مصرع کیوں بھول گئیں رفعت! آپ شعر ہمیشہ ادھورا کیوں پڑھتی ہیں؟" فیاض صاحب دھیمی آواز میں بولے۔

رفعت کو جیسے بجلی کے ننگے تاروں نے چھو لیا۔ دل کو تنہا چھوڑنا کہاں کی دانشمندی تھی۔

"آپ کیا جانیں کہ میں ایسی بنجر زمین ہوں جو بوند بوند بھر پانی کے لیے ترس چکی ہے۔ اور اب تو یقیناً بنجر زمین بھی نہیں۔ ریگستان ہوں۔ جہاں پودے نہیں اُگتے۔ پھل نہیں لگتے۔ کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ آپ کی مہربانیوں کو سمیٹ لینے کی سکت کہاں ہے مجھ میں۔

ایک سیلاب آجائے گا جو آپ کی گھریلو زندگی کو بہا دے گا۔ آپ کے پیارے پیارے بچے اور فرشتہ جیسی بیوی سبھی بہہ جائیں گے۔ آپ کی نوازش پیہم میرے درد کو اور بڑھا دے گی۔ مجھے عقل کے راستے ہی چلنا ہے۔"

دل جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا جس کے زیرِ لب آنے کا سوال ہی نہ تھا۔

"میرے کلاسیز تو ختم ہو چکے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے میں واقعی اسٹڈی سے دور ہو گئی ہوں۔ اسکول کے بعد جو لمحے میسر آتے ہیں ان میں کچھ مطالعہ کرنا ضروری ہے۔"

رفعت اٹھتے ہوئے بولی.... سہیلہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ پھر ایک ہفتہ گزر گیا۔ رفعت اسکول نہیں گئی۔ وہ دن اور رات جاگتی رہی۔ جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ آخر وہ ایک فیصلے پر بہ دقت تمام پہنچ سکی۔ پھر انہی غلیظ گلیوں میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی اسکول پہنچی کلاسیز شروع ہو چکے تھے۔ رفعت کلاس میں نہیں گئی اور ایک کرسی کھینچ کر فیاض صاحب کے سامنے بیٹھ گئی۔

"سر! یہ ایک درخواست ہے میرے ٹرانسفر کے لیے۔ میں دوسرے اسکول میں جانا چاہتی ہوں۔ آپ اس پر دستخط کر دیجئے۔ ایس۔ ڈی۔ او صاحب کو میں نے کہلوا دیا ہے۔"

پالش اڑے ہوئے ٹیبل پر فیاض صاحب کے سامنے اس نے اپنی درخواست رکھ دی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور دل ایک انجانے درد سے دکھا جا رہا تھا۔ وہ چونک پڑے۔

"لیکن کیوں۔ کیوں۔ کیوں؟ آخر آپ جانا کیوں چاہتی ہیں؟"

"بس یوں ہی میری مرضی۔"

"کوئی وجہ بھی ہو آخر؟ کیا آپ کو یہاں کوئی تکلیف پہنچی؟"

ساری پریشانیوں کا عکس اپنی طرف موڑتے ہوئے دل کی باتوں کو دل میں پیتے ہوئے بھرائی آواز میں رفعت نے کہا۔

"جی نہیں! مگر میرا دل نہیں لگتا یہاں۔ آپ پلیز دستخط کر دیں۔"

فیاض صاحب نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے اصرار پر

ہچکچاتے ہوئے دستخط کر دیئے.....ان کی انگلیوں میں قلم کانپ رہا تھا۔

رفعت بھاری دل لیے گھر لوٹ آئی۔

کلاسیز ختم ہوتے تو سبھی اساتذہ نیاض صاحب کے پاس آ بیٹھے۔نعیم صاحب نے ذرا ہمت سے کام لے کر پوچھا۔

"رفعت واپس چلی گئیں۔ان کی طبیعت خراب تھی کیا؟"

"نہیں! انھوں نے اپنا تبادلہ کروالیا۔جناب رشیدالزماں صاحب کی بیٹی کا دل یہاں نہیں لگا۔"

نیاض صاحب نے سپاٹ لہجے میں کہا اور رجسٹر پر جھک گئے۔

رشتے ٹوٹ گئے

کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے اس کے سوچنے کی نوعیت ہی بدل دی تھی۔ اس سے قبل وہ سجاد کے ہونے والے ایکسیڈنٹ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی اور زیادہ چوٹ بھی نہیں آئی، ورنہ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اور درد تو خیر..... چوٹ لگتی ہے تو ہو گا ہی۔ لیکن اب اسکوٹر کو بیچ دینا ہی ٹھیک ہے۔ بہت ہی DEFECTIVE سواری ہے۔ دو چکوں کے ساتھ پیروں کا بھی سہارا لیجیے، ورنہ الٹ جائیے.... نوکرانی نے آکر پانی گرم ہو جانے کی خبر دی۔ صورت اپنا آنچل سنبھالتی ہوئی اٹھی۔ اب سجاد کو کیسے بلایا جائے۔ یہ بھی ایک مرحلہ ہے۔ صبح ناشتہ کے بعد ہی سے سجاد نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ عیادت میں آئے ہوئے دوست احباب کا ایک جمگھٹا تھا۔ ایک جاتے تھے دو آتے تھے۔ تین بج رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کے لیے کہا تھا لیکن سجاد کے روزانہ کے دستور میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ گرم پانی تیار تھا۔ اس میں کچھ دیر بھی پیر ڈال کر رکھنا ضروری تھا، مگر سجاد صبح سے ہی نیچے صوفہ پر جا کر جم جاتے۔ پیر لٹکائے لٹکائے اور بھی سوج جاتا۔ ناشتہ کھانے کا کوئی وقت ہی نہ تھا بس چائے اور کافی کا دور چلتا رہتا۔ جب سب آنے والے رخصت

ہو جاتے تو سجاد لنگڑاتے، لڑکھڑاتے اور کراہتے ہوئے اوپر آتے اور بے حال پڑے رہتے۔ پھر امّاں باوا کا چونچلا شروع ہوتا۔

صولت اس ہنگامہ خیز۔ تصنع آمیز زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ روز روز کے یہ ہنگامے اُسے پھوٹی آنکھ نہ بھاتے۔ فرصت کے دنوں سے تو اچھا تھا، کہ آفس ہی کھلے رہتے۔ جو آنے والے آتے بھی، زیادہ سے زیادہ رات تک ہی اڈ امار کر رخصت ہو جاتے۔ یہ تمام دن کے چکر سے تو نجات رہتی۔ اب سجّاد کے بیروں کو کیسے سینکا جائے، وہ اسی الجھن میں پھنسی تھی کہ ایک ٹیلی گرام آگیا۔ مارے بوکھلاہٹ کے اس کی سانس رُک رک سی گئی۔۔۔۔ دُعائیں پڑھ کر جلدی سے اس نے لفافہ چاک کیا تو خوشی کی ایک لہر اس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔ اس کے گھر سے رفیق نے خبر دی تھی کہ "شاہدہ چند دنوں کے لیے آرہی ہے"۔ اور اب اس کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے اس کی نوعیت ہی بدل دی تھی۔

پانی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ سجّاد اب تک ڈرائنگ روم میں محفل سجائے بیٹھے تھے اور صولت اب سجّاد کو بلوانے کی بجائے کسی طرح پٹنہ جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک پل اب بھاری ہو رہا تھا۔ ماضی کی مہکتی ہوئی یادیں اس کو خوشبو کے ساگر میں لیے تیر رہی تھیں۔ کیا ہی یادگار دن تھے وہ، اور کیا ہی طربناک راتیں، جب زندگی فکر و پریشانیوں کے ذائقہ سے واقف نہ تھی۔

آج سے بیس پچیس سال قبل جب زندگی اتنی تیز رفتار نہ تھی، جب رشتے ناطے ایک خاص مقام رکھتے، ان دنوں جینے کے انداز ہی کچھ اور تھے۔ اور اس بزبچپن کا زمانہ ۔۔۔۔ گہری گہری نیندیں جھکولے کھاتے ہوئے جب خالو ابّا کے کار کا ہارن سنائی دیتا تو وہ سبھی بھائی بہنیں ایک ساتھ اٹھ کر کودنے لگتیں۔

"کہاں چلنا ہے خالو جان؟"

"میں بھی چلوں گی"۔

"میں بھی جاؤں گا!"

"جلدی جلدی سب گاڑی میں بیٹھو۔ آپ بھی چلئے آپا۔۔۔۔ مشتاق بھائی! آپ بھی چلئے نا، بہت جگہ ہے۔ دو دو گاڑیاں ٹھیک کر لی ہیں۔"

وہ سب بھائی بہنیں لمبے لمبے کوٹ پہنے، کوٹ کی جیبوں میں ٹوتھ برش اور کنگھا ڈال کر کار میں سما جاتیں۔ مارے خوشی کے ان کی زبانیں بھی تیزی سے چلتی رہتیں۔ جاڑے کی سرد رات میں چار بجتے بجتے بھی رات کی سیاہی اور بھاری پن میں کمی نہ آئی۔ سنسناتی ہوائیں اور تاروں بھری رات میں کار کی چمکتی ہوتی روشنی رات کی تاریکی کا منہ چڑھاتی ہوتی آگے بھاگتی جاتی۔ یہ بھی تقریباً ویسے ہی دن تھے اور ویسی ہی راتیں جن کے متعلق میر امن اپنی کہانیوں میں لکھا کرتے تھے کہ آدھی رات کو بھی کوئی پوچھنے نہ جاتا، کہ تمہارے منہ میں سونے کے کتنے دانت ہیں۔ گاڑیاں بھاگتی جاتیں، یہاں تک کہ صبح کی ہلکی ہلکی سفیدی پھیلنے لگتی۔ وہ سب اپنے گھروں سے پچاسوں میل دور، کسی پہاڑ اور جھرنے کے درمیان رُک کر تمام دن پکنک مناتے، پھر گھر واپس آجاتے۔ عجیب پرکیف دن تھے وہ، اور عجیب پُر کیف راتیں۔۔۔۔ سال پر سال بیتتے گئے اور پھر طویل سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ خالو جان لاہور چلے گئے۔ شاہدہ، راشدہ، نصرت، عفت، خورشید اور سارے بھائی بہن سب ہی چلے گئے۔ پٹنہ والوں نے لاہور میں بسیرا کیا۔ پھر بھی ہر گرمی کی تعطیل میں سب بھائی بہنیں لاہور سے پٹنہ آ ہی جاتیں۔ ہر سال خالو جان پابندی سے بچوں کو ہندوستان بھیجتے رہے۔ وہ دن بڑے اچھے گذرتے تھے۔ پھر پٹنہ میں قیام کی آخری رات آجاتی۔۔۔۔ رخصتی کی رات۔۔۔۔ سفر کی رات۔۔۔۔ سوٹ کیس، ہولڈال، کھانے کی باسکیٹ اور بھی چھوٹی بڑی چیزیں کمرے میں ایک ہی جگہ پر جمع کر کے رکھ دی جاتیں۔ رات کو بڑی ہی پر تکلف دعوت ہوتی تھی۔ آدھے سے زیادہ کھانے طویل دسترخوان پر ویسے ہی چھوٹ جاتے۔ رات کا بھاری پن دل کی اُداسی کے ساتھ بڑھتا جاتا۔ گنگناتے کمروں میں ایک اُداس خاموشی چھائی ہوتی اور صرف سائے سے چلتے پھرتے محسوس ہوتے۔

صولت، شاہدہ، راشد، نصرت، عفت، ممتاز سب ایک ساتھ کمرے میں روشنی

گھل گھل کر سونے کی ناکام کوشش کرتیں۔ اور ایک دوسرے کی قربت کے احساس کے لمحہ لمحہ کو اپنے دلوں میں جذب کر لینا چاہتیں۔ ویسے ہی رات گزر جاتی۔

اسٹیشن پر ٹرین آتی بھی چلی بھی جاتی۔ صولت اپنے ہندوستانی بہن بھائیوں کے ساتھ روتی دھوتی واپس آجاتی۔۔۔۔ پھر پاسپورٹ دکھا کر آنے والے راستے بھی مسدود ہو گئے۔ جنگیں جاری رہیں۔ نفرت پھیلتی گئی اور کتنے ہی سال بعد جب صلح و آشتی کا سفید جھنڈا لہرایا تو چھوٹے ہوتے، ٹوٹے ہوتے رشتے پھر سے جوڑے جانے لگے اور اب شاہدہ آرہی تھی۔۔۔۔۔ اس کی سب سے پیاری سہیلی اور بہن۔۔۔۔۔ دونوں ہم عمر تھیں۔۔۔۔ ساتھ ہی پڑھیں، ساتھ ہی پلیں اور پھر جدا ہو گئیں۔۔۔۔

سجاد لنگڑاتے، کراہتے اوپر چلے آرہے تھے۔۔۔۔ صولت کے تخیل کو اچانک ہی جھٹکا لگا۔

پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ کھانا تیار ہے۔ میں پرسوں فرید کے ساتھ پٹنہ چلی جاؤں گی۔۔۔۔ وہ جانے کیا کیا بک گئی۔۔۔۔ سجاد نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"پٹنہ چلی جاؤ گی؟ اور پھر شرما جی کی دعوت کا کیا ہوگا؟ تم چلی گئیں تو اُن کی بیوی بھلا کیوں آئیں گی۔۔۔۔ پھر عارف بھی تو شاید اسی ہفتہ آئے گا۔۔۔۔ ارے ہاں، وہ دعوت بھی تو ضروری ہی ہے۔ آخر سجاد کی ترقی کا سوال ہے"۔

شرما جی اس کے باس تھے اور ان کی بیوی نے کتنی ہی دفعہ مرغیوں کے سالن کا دم بھرا تھا۔ اس لیے یہ دعوت بھی ضروری ہی تھی۔ عارف کا اسکول بھی بند ہونے والا ہے۔ کتنے ہی دنوں بعد وہ ہاسٹل سے واپس آرہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ عارف کے آجانے پر ہی پٹنہ جاؤں گی۔ آخر شاہدہ اس کے بچوں کو بھی دیکھے گی یا نہیں؟ پرسوں ہی شرما جی کی دعوت کر دی جائے"۔

"شرما جی دیوگھر گئے ہیں اپنے دیوتاؤں کے چرنوں میں بھینٹ چڑھانے۔ وہ چھ سات دنوں بعد ہی آئیں گے"۔

صولت سانس روک کے دن گنتی رہی۔

عارف آگیا۔ شرما جی نہیں آئے۔

سجاد کے پیروں کا درد کم ہو گیا۔

اب مجھے ضرور ہی پٹنہ چلے جانا چاہیے۔

باڑھ کا پانی ٹرین کی پٹریوں تک چڑھ آیا ہے۔

راستے بند ہو گئے۔

شرما جی آگئے۔ دعوت ہو گئی۔ پانی کم ہو گیا۔ راستے کھل گئے اور صولت کسی طرح پٹنہ پہنچ گئی۔

"شاہدہ اور ظفر آج ہی بہار شریف زیارت کو چلے گئے۔ کل آجائیں گے۔"

صولت روہانسی ہو گئی۔ جیسے تیسے رات گزاری۔ دوسرے دن شاہدہ اور ظفر سب آگئے۔

دونوں سہیلیاں...... بہنیں گلے ملیں۔ خدا نے یہ دن بھی دکھائے۔ صولت کے آنسو جاری ہو گئے۔

"سجاد کیوں نہیں آئے؟" شاہدہ نے پوچھا۔ ویسے ہی اس کا ذہن دانیال کی طرف چلا گیا جو امتحان کی وجہ سے ہندوستان نہیں آیا تھا اور اب گھر ہی پر بیمار تھا۔ کل ہی اس کی امی نے خط سے تفصیل بھیجی تھی۔ سجاد کے پیروں میں ابھی چوٹ کا اثر باقی ہے۔ جانے سجاد کا پیر کیسا ہو گا..... صولت کا ذہن بھی الجھ گیا۔

"جانتی ہو آج ہی لاہور سے شنو کا ٹیلی گرام آیا ہے۔ دانیال فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس ہو گیا۔ اب اس کا داخلہ کروانا ہے۔ میں ۲۶ر کو واپس جا رہی ہوں۔ ریزرویشن ہو چکا ہے اور آج ۱۸ر تاریخ تو ہو ہی گئی۔ بس چند دنوں اور...."

"خدا جانے عارف کا رزلٹ آیا یا نہیں۔ صولت کو بھی عارف کی پڑھائی یاد آگئی...."

"مگر تمہارا ویزا تو ابھی ایک ماہ باقی ہے؟"

کالج کھلنے میں اب صرف چھ دن باقی تھے۔ ساری چھٹیاں تو سجاد کے پیروں کی خدمت گزاری میں نکل گئیں اور امتحان کے پیپر ابھی بند ہی پڑے تھے۔ کالج کھلنے سے قبل اُن کو بھی دیکھ کر ختم کرنا ہے۔

"میرا واپس جانا ضروری ہے صولت۔ ظفر کے پرموشن کا سوال ہے۔ سعود صاحب نے آنے سے قبل ہی بہت تاکید کی تھی اور پھر اُن کا خط بھی آیا ہے، اگر ہم لوگ وقت پر نہ پہنچ سکے تو ممکن ہے یہ پرموشن کسی اور کو مل جاتے۔"
عارف کا بھی میڈیکل چیک اپ کرانا ہے۔ یہ اسکول والوں کے بھی ایک ہزار نخرے ہوتے ہیں ...." خاموش کیوں ہوگئیں صولت؟"

وہ ہنس پڑی۔ "کچھ بھی تو نہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ مجھے بھی تو دو دنوں بعد ہی واپس جانا ہے۔ ڈھیروں کام چھوڑ کر بھاگ آئی ہوں۔ اگر وقت پر نہ پہنچی تو سب گڑ بڑ ہو جائیگی۔"

پھر دن بیت گئے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح۔ صولت پٹنہ گئی بھی اور واپس بھی آگئی۔ اب پھر وہ وہی دوسری منزل کے نفیس بیڈروم میں بیٹھی صولت، سجّاد کا جسمانی طور پر انتظار کر رہی تھی اور ذہن دور بہت دور پٹنہ اور پھر پٹنہ سے لاہور کی طرف جانے والی ریل کی پٹریوں پر بھٹک رہا تھا۔ "کیوں بی بی صولت سجاد! اب کس سوچ میں بیٹھی ہو؟ تمہاری بہت ہی پیاری سہیلی اور بہن شاہدہ تو اب واپس چلی گئی ہو گی۔ پاسپورٹ اور ویزا کی حراست میں۔ تم اس سے ابھی مل کر ہی تو آئی ہو۔ پر فقط ایک خواب کی سی کیفیت ہے کیا تم واقعی اپنی بہن سے مل آئی تھیں یا صرف کوئی خواب دیکھ آئی ہو؟"
صولت کراہ کر گنگنائی:

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا بھی ہے بولنا تک نہیں

ویسے ہی زینوں پر سجّاد کے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ صولت کے ذہن کو جھٹکا سا لگا وہ اپنی ساڑی کا آنچل سنبھالتی ہوئی اٹھی۔ سجّاد کے لیے ناشتہ تیار کرنا ہے.... لیکن پٹنہ اور لاہور..... شاید وہ کوئی خواب ہی دیکھ آئی تھی۔

رات بھاری ہے

سارا گھر الجھا ہوا تھا۔ کسی کو شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ کسی کی ٹرین کا وقت ہو گیا تھا۔ شانو ابھی کالج سے واپس آئی تھی۔ بھوک سے اس کی آنتیں اینٹھی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جب سے اُس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا اس کی بھوک کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ شاید خالہ بی کی بے پناہ دیکھ بھال اور رکھ رکھاؤ نے اُسے سچ مچ ہی چھوئی موئی کا پھول بنا دیا تھا۔

"کیوں بی بی! آپ کو کالج میں کھانے کے بدلہ ناشتہ ہی چلا گیا نا؟"

اس کی خالہ بی نے خیریت دریافت کی۔ وہ خفیف سی مُسکراہٹ کے ساتھ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی۔ اُس کا چہرہ کمہلایا سا لگ رہا تھا۔ مچھلی جیسے لچکیلے جسم سے پھولدار شیفون کی ساڑی اس طرح لپٹی ہوئی تھی، جیسے عشق پیچاں کی بیل منڈھی ہو۔ خالہ بی اُسے شفقت سے تک رہی تھیں اور ماما پلاؤ، قورمہ پیاز کے لچھے اور تلے ہوئے آلو کے قتلے کی پلیٹیں اُس کے سامنے رکھے میز پر سجا رہی تھی۔ شانو نے سوچا اگر یہی کھانے کالج میں پہنچتے تو اس کے ساتھیوں میں اُس کا سر کتنا اونچا ہو جاتا۔ مگر وہاں تو شامت اعمال تلے پراٹھے اور انڈے کا آملیٹ ہی نکل آیا...... تو پھر کیا ہوا ڈھاک تو اُس کی یوں بھی

جمی ہوئی ہے۔ بھلا کس لڑکی کا کھانا اس طرح کالج میں سج سجا کر پہنچتا ہے جیسے رحمت پینٹ شرٹ پہن، اپنے بالوں کو سنوار، سائیکل پر ٹفن کیریر لیے لیڈیز کامن روم کے دروازے کے قریب اُس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ وہ کس شان بے نیازی سے اپنی ساتھیوں سے معذرت کر کے بس کسی ایک کے ساتھ اپنا لنچ کھا لیتی ہے۔ ابتدا میں تو اُسے بے حد شرم آتی تھی۔ بھلا تمام ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ وہ خود کس طرح اپنا پیٹ بھر لیتی۔ مگر بار بار خالہ بی کے یہ سمجھانے پر کہ اُس کے خاندان کی بات ہی کچھ اور ہے اُسے بھی اپنے خاندان کی اہمیت کا احساس ہو چلا تھا۔ اُسے دلّی آئے ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے۔ خوش قسمتی سے میڈیکل کالج میں داخلہ بھی مل گیا تھا۔ نجمی بھائی جان جو اس کے کزن تھے وہ دو سال قبل ہی میڈیکل پاس کر کے امریکہ جا چکے تھے۔ اس خاندان کی یہ پہلی لڑکی تھی جس نے میڈیکل پڑھنے کی ٹھانی تھی۔ اس لیے اس کی اہمیت خاندان میں ذرا یوں بھی بڑھ گئی تھی۔ پھر اس کی موہنی صورت اور خود کو لیے دیئے رہنے کے انداز نے اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش پیدا کر دی تھی۔ خالہ بی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ وقت پر کھانا کھانا صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ بھلا بھوکے پیٹ میں اس کا شہابی رنگ پھیکا نہ پڑ جاتا۔

ممتاز خالو جان اور خالہ بی کی ہستی اس بڑے شہر میں نہایت غنیمت تھی۔ ورنہ اس خاندان کی یہ پرواز کہاں تک ممکن تھی؛ خاندان کے ہر فرد و بشر کا ٹیڑھا میڑھا کام بھی یہاں چٹکیاں بجاتے ہو جاتا۔ ممتاز خالو جان ہر اعتبار سے ممتاز تھے۔ وہ صرف اپنی یونیورسٹی کے پروفیسر ہی نہیں تھے بلکہ ہندوستان کے چند دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اُن کا گھر شاعری کا ایک مکمل نمونہ تھا۔ خالہ بی بھی کیسا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ پھر یہ کہ ممتاز خالو جان کا دل بھی کتنا فراخ تھا۔ خدا نے ان کو عزت شہرت دولت سب عطا کی..... بس ایک اولاد نہیں، تو پھر کیا ہوا۔ انھوں نے خاندان کے ہر بچہ کو ہی اپنی اولاد سمجھ لیا۔ اُن کی بے پناہ محبت کسی ایک کے لیے مخصوص نہ ہوئی تو ہر ایک ہی ان کی محبت کا مستحق ہو گیا۔ خدا واقعی کارساز ہے۔ اس خاندان کی عزت افزائی اسے منظور

تھی سو اس حال میں اس نے پورا کیا۔ یہ بھی ٹھیک ہی ہوا جو ان کی اپنی اولاد نہ ہوئی ورنہ کیا وہ اپنے خاندان کے ہر فرد و بشر سے اتنی ہی محبت کیا کرتے؟ کیا خالہ بی اس کے لیے ٹفن کیریر میں اسی طرح کھانا سجا کر بھیجا کرتیں یا وہ بھی اگر بہت خوش ہوتی تو کالج کی تمام لڑکیوں کی طرح کینٹن میں جا کر چائے پی لیتی۔ مگر اُف! اب اُسے چائے سے کتنی نفرت تھی۔ وہ چائے کے عوض صبح شام ایک پیالی دودھ یا پھلوں کا عرق ہی پی لیتی تھی۔ خالہ بی اُس کا خیال بھی کتنا رکھتی تھیں۔ آخر میڈیکل کی پڑھائی ہے کچھ مذاق تو نہیں۔ ممتاز خالو جان بھی اُسے کتنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے چاہنے یا نہ چاہنے کا کیا۔ وہ تو ہر ایرے غیرے سے بھی یوں ہی محبت کیا کرتے ہیں۔

شانو کے خیالات کی رفتار اُس کے کھانے سے بہت تیز تھی .... اور .....
اور ان کے اسٹوڈینٹس ..... اُن سے تو اسے نفرت تھی۔ سخت نفرت۔ اُن کی یہ بھیڑ بھاڑ اسے پھوٹی آنکھ نہ بھاتی۔ یہ تو جونک تھے بالکل جونک۔ سارا وقت ان کی جان سے چپکے رہتے۔ ممتاز خالو جان کا سارا وقت تو وہی کھا لیا کرتے تھے۔ اور یہ لڑکیاں کیسی ڈھیٹ ہیں جو گھر والوں کے سامنے ہی ہنس ہنس کر کہتیں۔

"آپ کی اولاد تو ہم ہی لوگ ہیں نا سر؟ اور کون ہے دوسرا؟ بس آپ کی کتابیں اور آپ کے شاگرد۔"

جیسے ممتاز خالو جان کے اور کوئی رشتہ دار ہی نہیں بھلا ہم لوگ کیا لگے ان کے۔ مگر ممتاز خالو جان بھی تو بُرا نہیں مانتے۔ ہنس کر کہتے۔

"ہاں ٹھیک ہی کہتی ہو تم۔ تم ہی لوگ تو میرا سرمایہ ہو اور میری عزت۔"

سوچتے سوچتے شانو کا جی جل گیا۔ اور وہ کم بخت سائرہ کی بچی تو جب آتی سارے مکان میں اس طرح دندناتی چلتی جیسے اس کے ابّو نے اسی کے لیے تو بنوایا ہو یہ مکان۔

سیدہ خالہ کا موڈ ایک دم خراب ہو رہا تھا۔ گلنار آپا مارکٹ جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انھوں نے اپنی کسی دوست کو چائے پر بلایا تھا۔ اور اب وہ گل گلنار بنی اس کی آمد کی منتظر تھیں۔ جل بھن کر سیدہ خالہ اکیلے ہی مارکٹ جانے کو تیار ہوئیں۔ چار بج چکا

تھا۔ ماما ابھی تک چائے نہیں لائی تھی۔ اب اس وقت کوئی چائے پئے بنا ہی کیسے نکل پڑتا۔ ڈھیروں سامان خریدنا تھا۔ آخر شادی بیاہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو نہیں۔ وہ بھی ایک نہیں تین تین شادیاں۔ ممتاز خالو جان کی طبیعت کافی خراب تھی۔ انھیں دل کے دورے پڑ رہے تھے۔ یہ اچانک ہی اس موذی مرض نے انھیں پکڑا تھا۔ کسی وقت بھی ان کی زندگی کی شمع گل ہو سکتی تھی۔ ایسی حالت میں جلد شادیاں ہو جانا ہی اچھا تھا۔ سیدہ خالہ کو عجلت پڑی تھی۔ وہ اچھی خاصی وہمی بھی تھیں۔ ممتاز خالو جان کی دُعاؤں کی چھاؤں میں نئی زندگی کا شگون بھی نیک ہی ہوتا ہے۔ سنتے ہیں کہ نیک دل بزرگوں کی دُعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ پھر سیدہ خالہ اور اشرف ماموں کو آسانیاں بھی کتنی ہو جاتیں۔ شادی بیاہ کا آدھا خرچ تو ممتاز خالو جان ہی اٹھا لیتے۔ سارا ہنگامہ، ساری مہمان نوازی تو خالہ بی کے سر ہوتی۔ خالہ بی بھی کتنی عظیم ہیں کہ تمام وقت مہمانداری کرتے نہ تھکتیں۔ دل ہو تو ایسا۔ وہ تو خدا بھلا کرے رحمت کا جو ممتاز خالو جان کی تیمار داری وہ اچھی کر لیتا ہے۔ ورنہ خالہ بی کو اتنی فرصت ہی کہاں ملتی۔ ایک نجمی بھائی جان تھے۔ جو ممتاز خالو جان کی چھوٹی موٹی بیماری پر انھیں اپنے ہاتھوں سے دوائیاں کھلایا کرتے تھے، لیکن وہ بھی میڈیکل پاس کرتے ہی امریکہ چل دیئے۔ ہائے ممتاز خالو جان انھیں کتنا چاہتے تھے بالکل اپنے بیٹے کی طرح۔

گھر پر ایک ہنگامہ تھا۔ روز روز کے ہنگاموں سے بہت بڑا ہنگامہ۔ سامنے لان میں ایک وسیع شامیانہ کھڑا تھا۔ چاروں طرف قمقمے جگمگا رہے تھے۔ خوبصورت کپڑوں کی جگمگاہٹ میں ہر کوئی خوبصورت لگ رہا تھا۔ بارات آ چکی تھی۔ ایک نہیں دو دو لہے، دو لہنیں۔ گھر والوں کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ خاطر تواضع میں کسی طرح کی کمی نہ ہو۔ مہمانوں میں کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ باراتی کم نہ تھے مگر یہ خالہ بی کیسی زبردست انتظام کار ہیں جو ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پا رہا تھا۔ شانو بھیڑ بھاڑ سے بھاگ کر ایک اندھیرے کمرے میں دریچہ سے کھڑی جھانک رہی تھی۔ جانے کیوں اُداسی اس کے دل میں دندناتی گھسی چلی آ رہی تھی۔ بھاری کپڑوں کے بوجھ سے یا دولت و ثروت کے اس بے پناہ مظاہرہ سے۔ بہرحال وہ اس

طربناک ساعت میں بھی اُداس تھی - جانے کیوں - تھک کر اُس نے ایک لمحہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں جیسے ایک یگ بیت گیا. اُسے اپنے اطراف میں ایک ہولناک سنّاٹے کا احساس ہوا. بینڈ پارٹی کی آوازیں مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں - دو دلہنیں دُعاؤں کی چھاؤں میں رخصت ہوئیں - ویسے ہی شانو کو یاد آیا کہ سیدہ خالہ یا خالہ بی کسی نے بھی تو ذکیہ اور نسیمہ کو دلہنیں بنا کر ممتاز خالو جان کو نہیں دکھایا - نہ ہی اُن کی دُعاؤں کے لیے وہ ان کے کمرے تک لے گئیں - وہ بے چارے تو خیر بستر سے لگے تھے - ڈاکٹروں نے انھیں نہ اٹھنے کی سخت تاکید کی تھی اور اگر تاکید نہ بھی کی ہوتی تو کیا وہ اُٹھ سکتے تھے ؟ ...... اور ...... اور ......

اور شادی کے اس ہنگامے میں، دعوت و ضیافت کے اس طویل پروگرام میں ان کا سادہ کھانا بھی تیار ہوا تھا ؟ انھیں دوائیں دی گئی تھیں ؟ شانو کا ذہن ہر طرح سے الجھ گیا۔ وہ گرتی پڑتی ممتاز خالو جان کے کمرے تک پہنچی - وہاں منظر ہی عجیب تھا۔ ممتاز خالو جان مسہری سے گر کر زمین پر پڑے تھے - سرہانے میز پر رکھی شیشیاں گر کر چور چور تھیں۔ رنگین دوائیں زمین پر بہہ کر کچھ عجیب نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ شاید وہ اپنی کسی ضرورت کے تحت اٹھے تھے۔ ہائے اس ہنگامہ میں آج کم بخت رحمت بھی چوک گیا تھا۔ جلدی سے شانو نے نبض ٹٹولی اور گھبرا کر زور سے چلائی - اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ویسے ہی خالہ بی، سیدہ خالہ اور گھر کے بہت سے لوگ دوڑے آئے۔ مریض غم کی یہ بھاری رات گزر چکی تھی۔

صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی اور اس ملگجی صبح میں آسمان پر ایک تنہا اداس تارا ٹمٹما رہا تھا.....

تیرا ہی عکس ہے

آگے آگے نمیّ اور پیچھے بھاگتے اُچھلتے بچوں کی ایک فوج رحمان منزل کے بڑے سے احاطہ میں پھیل گئی۔ شاید پھر کوئی جھگڑا ہو گیا ان کے درمیان۔ پیچھے بھاگتے بچوں نے جلدی ہی نمیّ کو جا لیا اور اس کی اچھی خاصی پٹائی ہو گئی۔ نمیّ وہیں گھاس پر بیٹھ کر پچھاڑیں کھانے لگا۔ دوسرے بچے اِدھر اُدھر چل دیئے۔ ویسے ہی پونم بھاگتی آئی اور اس کے بازو میں بیٹھ کر اسے چپ کرنے لگی۔

"چپ ہو جاؤ بابا۔ تم کو کس نے مارا؟ چپ ہو جاؤ...."

نمیّ اور بھی زور زور سے رونے لگا۔

محمد عظیم بیگ کی تیرھویں اولاد نعیم بیگ ابھی ایک ہی سال کا تھا جو اُن کی بہو بیگم کو جڑواں بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئی۔ دھنی پوت تو تین دن بعد ہی فوت کر گیا مگر بیٹی جیسی پرائی دھن ماں اور دادی کے گودوں پروان چڑھنے لگی۔ بہو بیگم کی کمسنی کی اولاد تھی اور محمد عظیم بیگ کی یہ تیرھویں اولاد۔ محمد عظیم بیگ ہٹے کٹے مضبوط کاٹھی کے زمیندار تھے اور خیر سے ان کی بیگم کی بھی تندرستی کو دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے۔ دونوں ساس اور بہو جب اپنے اپنے بچوں کو آنچل میں سمیٹ کر بیٹھ جاتیں تو وہ

ساس اور بہو نہیں بلکہ جیٹھانی اور دیورانی معلوم ہوتیں۔

محمد عظیم بیگ اپنے علاقے کے ایک بڑے زمیندار اور نامی وکیل تھے ان دنوں وکالت ہی ایک ایسا پیشہ تھا جسے بنا کسی غلامی کے رئیس بڑی خوشی سے اپناتے تھے۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی اور روپیہ کے ساتھ ساتھ خدا نے دل والا بھی بنایا تھا۔ اس لیے خاندان والے محمد عظیم بیگ سے اور محمد عظیم بیگ اپنے تمام خاندان والوں سے چمٹے رہتے تھے۔ محمد عظیم بیگ کی بہنیں، بھائی، ان کے بچے اور سالا سالیوں کا جمگھٹا ہمیشہ ہی حویلی میں موجود رہتا تھا۔ ان کے رکھ رکھاؤ کا انداز شاہانہ تھا۔ وہ اصول کے پابند اور ذرا سخت قسم کے آدمی تھے۔ اس لیے گھر کے بچے اور بڑے اکثر ان سے گھبراتے تھے۔ محمد عظیم بیگ ویسے بھی ذرا الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔ مگر اُن کی ایک ہی کمزوری تھی اور وہ تھا نعیم بیگ۔ ایک تو بوڑھاپے کی اولاد اور اس پر گلاب کے پھول جیسا شاداب بچہ۔ محمد عظیم بیگ کیا خاندان کا ہر مرد ہی وادی صدقہ ہوتا تھا۔ محمد عظیم بیگ کے خاندان میں نعیم بیگ کے علاوہ ایک اور بھی ہستی قابل ذکر تھی اور وہ پونم تھی۔ پونم نعیم کے اطراف ایسے پھیرے ڈالتی جیسے اس کا الگ کوئی وجود ہی نہ ہو۔ بلکہ وہ شبنم کی ایسی کومل بوند ہو جو پھولوں کے نکھار کو دیرپائیت بخشتی ہے۔

دونوں کی عمر کے درمیان ایک سال کا وقفہ تھا۔ فقط ایک ہی سال کا..... پونم بہو بیگم کی پہلی اولاد تھی اور نعیم محمد عظیم بیگ کی تیرہویں اولاد..... تیرہویں کا شمار کچھ عجیب بے تکے سے انداز میں نعیم کی زندگی سے چمٹ گیا تھا۔ سب سے چھوٹا کیا سب سے ادنیٰ؟؟؟ دونوں بچوں کے درمیان معصوم سی محبت اور اپنائیت کا ایک ایسا رشتہ قائم تھا جو ہر طرح کے احساس سے پرے تھا۔

بہو بیگم ذرا مزاج دار عورت تھیں، اس لیے ساس سسر کی خاطر داریاں بھی انھیں زہر لگیں۔ جبکہ زمانہ میں بہویں مر جاتی تھیں مگر سسرال سے قدم نہ نکالتی تھیں۔ بہو بیگم محمد عظیم بیگ کی حویلی چھوڑ اپنے شوہر سمیت میکہ جا بسیں۔ جانے میاں بھی کون سا گڑ کا لڈو کھائے بیٹھے تھے جو انھیں چوں بھی کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر دادی کو اپنی پوتی

ایسی بھائی کہ وہ اسے ماں کے ساتھ جانے دینے کو کسی طرح تیار نہ ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پونم نعیم بیگ کی گہری دوست بن گئی۔ ماں کے جانے کا احساس نعیم بیگ کی ہمسائیگی میں کم ہو گیا۔ وہ بابا۔ بابا کہتی ہر کھیل میں اس کے شریک ہوتی۔ ماں کی پہلی اولاد اکثر دیکھا گیا ہے کہ نیک ہی ہوتی ہے۔ سو وہی نیکی اور فرما برداری پونم کے حصے میں آئی تھی۔ نعیم ضدی اور ہٹی تھا۔ مگر جب وہ پونم کے ساتھ ہوتا تو اپنی تمام ضدوں کو بھول کر اس کی خاطر داریوں میں مصروف رہتا۔ پونم سے اس کی کبھی لڑائی نہ ہوتی۔ اور پونم ابتدا ہی سے اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی۔ بچپن میں اس کے کھلونوں کا، لڑکپن میں اُس کی کتاب اور کاپیوں کا خیال رکھتی اور...... جب عارض کے گلاب پر شفق کی لالی ابھی پھوٹنے بھی نہ پائی تھی اور پلکوں کے بھاری پن کا احساس آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ ویسے ہی پونم نے نعیم کو بابا کہنا چھوڑ دیا اور چھوٹے ابا پکارنے لگی۔ وہ اب اس کی کتاب کاپیوں کو سنبھال کر رکھنے کے بدلہ اس کے کھانے اور کپڑوں کی مرمت کی طرف دھیان دینے لگی اور چھوٹے ابا پونم کی نفاست اور ہنرمندی کی داد دیتے۔

"کالج کا وقت ہو گیا۔ چھوٹے ابا کہیں بھوکے ہی نہ چل دیں۔" پونم اپنی کتاب کاپیوں کو پرے دھکیل کر باورچی خانہ دوڑی جاتی۔ رات کے بناتے ہوئے روکھے سوکھے پراٹھوں پر گھی کا پچارا دے کر توے پر الٹتی پلٹتی گرم گرم بھاجی کے ساتھ چھوٹے ابا کے لیے سینی سجائے اُن کے پاس پہنچ جاتی۔ نعیم تشکر بھری نگاہ سے پونم کو دیکھتے اور جلدی جلدی ناشتہ حلق کے نیچے اتار کر کالج چل دیتے۔

چھوٹے ابا کے آنے کا وقت ہو گیا...... دادی اماں اُن کو ناشتہ کیا دیا جائے گا؟ چائے کی پتیاں ختم ہو گئی ہیں۔ جلدی سے منگوا لیجئے...... یہ کم بخت دھوبی چھوٹے ابا کی قمیص کے سارے بٹن جانے کیوں توڑ لاتا ہے...... ضرور اس کو چھوٹے ابا سے نفرت ہو گی۔" پونم جلدی جلدی قمیص میں بٹن لگاتی ہوئی سوچتی جاتی۔

دادا ابا کے اتنے سارے رشتہ داروں اور بیٹی دامادوں کے ہنگاموں میں

اگر پونم نعیم کا خیال نہ رکھتی تو پھر کون رکھتا۔ دادی اماں کی تندرستی بھی اب خراب ہو رہی تھی۔ بیٹے اور بہوئیں اب زیادہ تر اِدھر اُدھر نوکری پہ چلے گئے تھے۔ بیٹیاں اگر آتیں بھی تو اپنے بچوں اور شوہروں کے نخروں ہی میں الجھی رہتیں۔ پھر ان کے گھومنے پھرنے کا سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سارے ہی رشتہ دار شہر میں بکھرے پڑے تھے۔ اب اُن سے ملے بنا کیسے کوئی اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتا۔ مگر وہ تو پونم تھی جو اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگتے سبھوں کے کام کر ڈالتی اور دادا ابا کے دیئے ہوئے سبق بھی رٹتی جاتی۔

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے

یا کبھی

"کریما بہ بخشائے بر حالِ ما"
کی گردان شروع ہو جاتی۔

نعیم کو اس دقیانوسی قسم کی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ بہت سی لڑکیاں اسکول اور کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ نئی تعلیم کے رنگ و روغن میں اُن کی پرسنیلٹی کا نکھار ہی کچھ اور ہو جاتا تھا۔ اور یہ ...... یہ پونم جو اتنی اچھی ...... اتنی سادہ ہے تعلیم پا کر کیسی نکھر جائے گی ...... سینکڑوں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک وہ ہو سکتی تھی ...... مگر ابّو کو کون سمجھاتے۔ آخر وہ اسکول کیوں نہ جاتے ...... وہ کب تک مسدس اور گلستاں و بوستاں کے اشعار رٹتی رہے گی۔ کبھی کبھی نعیم بیگ اسے تاریخ اور جغرافیہ بھی پڑھانے بیٹھ جاتے۔ کچھ تو دُنیا کا علم رہے۔ مگر کتابوں سے زیادہ پونم کے کندن جیسے چمکتے رنگ میں اُلجھ جاتے ... کتنی خوبصورت ہے یہ پونم بھی ...... مدھو شالہ جیسی آنکھیں، سرو کے جیسا قد اور لچکتا ہوا بدن......

نعیم کا چہرہ سُرخ ہو جاتا، کان کی لویں جلنے لگتیں اور جسم سے شبنم کے جیسی

بوندیں اچانک ہی پھوٹ بہتیں ...... وہ تیزی سے پونم کی کتابوں کو دھکیل اپنے پسینہ سے بھیگے چہرے کو پونچھتا کالج کی طرف روانہ ہو جاتا ...... ویسے ہی راستہ میں اسے خیال آتا ...... کون خوش قسمت ہوگا وہ، جو پونم جیسی لڑکی کو اپنے گھر بیاہ لے جائے گا ...... اُف اس کے بعد اسے کتنی تکلیف ہو گی ...... کون اس کا اتنا خیال رکھے گا کھانے ناشتے کا پابندی وقت کے ساتھ ...... نعیم کا چہرہ پھر پسینہ سے شرابور ہو جاتا ...... اُس کے ذہن کو اچانک ہی جھٹکا لگتا۔ اس کی سائیکل کسی رکشہ کی زد میں آتے آتے بچتی۔

"دیکھ کر چلا کرو بھیا، کیوں اپنی جان کے دشمن ہوتے ہو۔"

گاڑی چلاتے چلاتے بھی کوئی کھڑکی سے منہ نکال اسے تنبیہہ کر جاتا اور نعیم کے شہابی رنگ پر سیاہ بادل سے لہرا جاتے ...... جانے کیوں ...... جانے کیوں ...... اسے زندگی ابھی سے ہی لایعنی اور بے مفہوم سی معلوم ہونے لگتی ...... دن سرکتے گئے اور نعیم پر سنجیدگی کا غلاف چڑھتا گیا۔ وہ سمٹے سمٹے اپنے آپ میں گم ہو کر رہ گیا۔ پونم چھوٹے ابا پر جان چھڑکتی رہی اور اس کے مغموم چہرے کو اداس نظروں سے تک تک کر اداس ہوتی رہی۔

ایک دن نعیم بیگ بڑے خوش و خرم حویلی میں داخل ہوئے۔ رازدارانہ انداز میں دیر تک محمد عظیم بیگ سے گفتگو میں مصروف رہے اس کے بعد بہو بیگم اور بڑے بیٹا کو آدمی بھیج کر بلوایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حویلی رشتہ داروں سے بھر گئی اور میراثنیں ڈھولک کی تھاپ پر دُنیا جہان کے لوگ ٹونے کی تانیں اڑانے لگیں ...... پونم کی شادی نعیم بیگ نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے طے کر دی تھی۔ تعلیم بھی اچھی تھی اور گھرانا بھی بڑا تھا ...... اور کیا چاہیے تھا؟ لڑکا صورت و شکل کا بھی کچھ ایسا بُرا نہیں ...... سانولا سلونا تندرست نوجوان تھا۔

پونم نے اپنی شادی کی خبر حسرتناک خاموشی سے سنی اور زخمی نگاہ سے نعیم بیگ کو تکتی رہ گئی ...... بابا ...... نئی ...... نعیم بیگ ...... کاش نعیم بیگ

تم کبھی بڑے نہ ہوتے۔ کاش میرا بچپن اسی جگہ پر تھم جاتا۔

لکڑی جل کوئلہ بھئی، کوئلہ جل بھئی راکھ

میں پاپن ایسی جلی، کوئلہ بھئی نہ راکھ

"بیٹی کیوں روتی ہے۔ لڑکیاں پرائی دھن ہوتی ہیں وہ اپنی سسرال ہی میں سجتی ہیں۔ میں تجھے کب تک اپنے آنچل میں چھپا کر رکھتی"۔ بوڑھی دادی رو رو کر پونم کو سمجھاتیں۔

ایک دو تین...... گیارہ بارہ تیرہواں زینہ نعیم بیگ سدا ہی پھلانگ جاتے تھے۔ لیکن وہ اپنا پیدائشی زینہ نہ پھلانگ سکے..... اور اسی کا احساس نعیم بیگ کو ہمیشہ خوفزدہ رکھتا۔ کون جانے قسمت کی کوتاہی کونسا رنگ لائے...... وہ سہم کر کبھی پونم کو دیکھتے۔ کبھی اپنے آپ میں گم ہو جاتے۔ اپنی بے چارگی کا احساس انھیں ہر وقت ستایا کرتا۔ کاش وہ باپ کی سب سے چھوٹی اولاد نہ ہوتا۔ کاش یہ تیرہ کا شمارہ اس طرح کی تقدیر سے چمٹ کر نہ رہ جاتا۔

پونم روتی رمتی اپنی سسرال رخصت ہو گئی۔ لیکن دل کے آئینہ میں ایک عجیب ہی نقش تھا۔ کچھ نعیم بیگ سے ملتا جلتا۔ ایوّب اچھا بھلا نوجوان تھا۔ مگر جانے کیوں اسے دیکھ کر پونم بدحواس سی ہو گئی۔ ایوّب اسے سخت ناپسند ہوئے۔

اُف کیسے غلیظ رنگوں کے کپڑے پہنتے ہیں یہ..... اور ٹائی کیسی بے جوڑ لگائی ہے۔ بال بھی ایسے سنوارے کہ اچھے بھلے چہرے کا بھی ستیاناس ہو گیا۔ ایک چھوٹے ابّا کے خوبصورت، لچھے دار بالوں کا اسٹائل ہے...... مگر پونم کہتی تو کیا کہتی...... خاموش نظروں سے اسے تکتی رہی۔ کبھی اپنے بال سنوارتے ہوئے اسے آئینہ میں ٹھیک اپنے پیچھے نعیم کا چہرہ نظر آ جاتا۔ وہ گھبرا جاتی۔ اِدھر اُدھر دیکھتی تو بس خاموشی اور تنہائی..... جانے یہ مجھے کیوں ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں۔ چھوٹے ابا چھوٹے ابا ہیں..... میرے سگے چچا...... اور ایوّب..... ایوّب ہیں...... میرے شوہر...... میرے سب کچھ...... خواہ وہ جیسے بھی ہوں...... پونم بڑی ہمت

سے سوچتی اور دھیمے دھیمے گنگناتی سے

تیرا ہی عکس رات کے آئینہ میں اسیر
تیرا ہی خواب نیند کے بستر پہ نقش ہے

اور نیند کے بستر پر دو چہرے ایک ساتھ ابھرتے ڈوبتے گڈمڈ ہو جاتے۔
شادی کے ہنگامہ کے بعد محمد عظیم بیگ کی حویلی میں خاموشی تھی .... ویسی ہی خاموشی جو بیٹی کو رخصت کرنے کے بعد ہوتی ہے .... مگر نعیم کے کمرے میں ایک عجیب سا سکوت تھا۔ جیسے موت کا سکوت۔ نعیم بیگ اپنے کمرے میں خوف زدہ سے بیٹھے رہتے۔ جانے کیسا خوف تھا جو انھیں بے چین رکھتا۔ ماں اور بہنیں انھیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتیں۔ نعیم بیگ کی خاموشی سے گھبرا کر ماں نے اُس کی شادی کی رٹ لگائی۔ بہنیں بھی سمجھاتے سمجھاتے ہار گئیں۔ مگر اس کی ایک "نا" ہاں میں نہیں بدلی۔ آخر محمد عظیم بیگ نے ہی معاملہ کو ہاتھ میں لیا اور نعیم بیگ کو صاف لفظوں میں شادی کرنے کا حکم دیا۔

"ابا جان گستاخی معاف۔ میں نے کبھی آپ کا کوئی حکم نہیں ٹالا۔ مگر میں مجبور ہوں۔ آئندہ آپ مجھ سے کبھی شادی کا ذکر نہ کریں۔ مجھے شادی کے نام سے نفرت ہے ......" نعیم خوف زدہ ہونے کے باوجود بول گئے ...... محمد عظیم بیگ کو ایسے دو ٹکے جواب کی توقع نہ تھی .... وہ سکتہ میں آگئے۔

اعترافِ شکست

صولت کی ساس بی کا پارہ آسمان پر پہنچا ہوا تھا۔ اُجلی برّاق ساری پہنے ہاتھوں میں سفید دانوں کی تسبیح گھماتے، انگلیوں کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی تیزی سے چل رہی تھی۔

"نوج! اب اس گھر کی ریت ہی بدل گئی۔ بھلا اب مہتر کی بھی اتنی ہمت کہ وہ میری جانماز کی چوکیوں تلے جھاڑو لگا کر پونچھائی کرتا چلے۔ حد کر دیا۔ منجھلی دولہن نے بھی۔ یہ سب میری قسمت کا قصور تھا۔ نہ سجاد کے ابا وقت سے قبل سدھارتے نہ میرے نصیبوں کا یہ لکھا پورا ہوتا۔ بڑی دولہن تو خیر اپنی بھانجی ہی تھیں لاکھ زبان کی تیز سہی لیکن پُرانا چاول سدا ہی کام آتا ہے اور منجھلی دولہن تو بلیس کرم کا لکھا پورا کرنے آئی ہیں۔ نگوڑے سب بیٹے کا مت ہی مار دیا۔ جب ہی تو راج کرتی ہیں۔"

"مائی جی! پیر اوپر اٹھا لیجئے۔" زمین کا فرش پونچھتے ہوئے مہتر نے اماں بی کو آواز دی۔

"نگوڑا موا سارے کرے ہی ہیں....."

"اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں۔"

صولت اماں بی کے غصّے سے بے خبر جھوم جھوم کر الاپتی سیڑھیاں چڑھتی چلی آرہی تھی۔

"راستے میں رُک کے دم لوں میری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں
اور کوئی ہمسفر مل جائے یہ قسمت نہیں"

اپنے شانوں پہ جھولتے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ ویسے ہی اسے اماں بی کی چرچراہٹ سنائی دی۔

"اے بی! کچھ تو شرم و حیا سے واسطہ رکھو۔ گھر کی بہو بیٹیاں کیا اسی طرح لونڈوں چھوکروں کے سامنے راگ الاپتی پھرتی ہیں"۔

صولت کا دم ہی نکل گیا۔ اس کا اچھا بھلا موڈ بگڑنے لگا۔ الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے اور ایک لمحہ کے لیے وہ سکتہ میں آگئی۔

"کیا کروں ...... کیا کروں .... اے غم دل ....."

اپنے دل و دماغ کے جھرجھکوں کو بند کرنے کی کوشش میں وہ پُرانے گھسے ریکارڈ کی طرح ایک ہی جگہ پر اٹک گئی۔ ذہن میں آندھیاں شنشنا رہی تھیں۔ چہرے پر کئی رنگ آتا تھا جاتا تھا۔ ایک کشمکش کا عالم کہ ویسے ہی اس نے اپنے سر کو جھٹک دیا۔ شانوں پر کھلے بال لہرا گئے۔

"اونہہ اماں بی کا یہ پُرانا دستور ہے۔ خواہ مخواہ ہی پیچھے پڑی رہتی ہیں"۔

صولت بی! اپنے کام سے کام رکھو۔ ان کی باتوں کا بُرا ماناتو زندگی اجیرن ہو جائے گی، ڈھیروں کام پڑے ہیں ابھی۔ اور عید کو اب دو دن بھی تو نہیں رہے۔

دل ہی دل میں اس نے خود کو تسلّی دی اور وہاں سے ٹل گئی۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لہرائی۔

"یہ ضعیفوں کو جانے کیا ہو جاتا ہے جو خواہ مخواہ ہی غصّہ کرنے کی لت انھیں لگ جاتی ہے۔

اماں بی کی جلی کٹی باتوں پر سجّاد کا دل دُکھ سے بھر جاتا تھا۔ وہ منہ لٹکائے بیٹھ جاتے تھے اور صولت کو ایسے لبسورتے چہرے سے وحشت ہونے لگتی تھی۔

"بھئی دُنیا میں ڈھیروں غم ایسے ہی بھرے ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ دل جلانے کا حوصلہ کتنا ہے آپ کو۔ کیا ہنسی خوشی زندگی کے دن گذارنے میں تکلیف ہوتی ہے؟"

سجّاد، صولت کی ایسی باتوں پر فدا تھے......

اور اماں بی صولت کی حرکتوں سے مستقل بیزار۔ جب سے سجّاد آبائی مکان کو چھوڑ کر کالج کیمپس کے کوارٹر میں آیا تھا سب سے بڑی مصیبت اماں بی کے لیے طہارت کا مسئلہ تھا۔ نگوڑا موا مہتر پورے مکان ہی میں دندناتا پھرتا تھا۔ ورنہ پہلے مجال تھی کہ وہ صحن چھوڑ کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بھی قدم رکھتا۔

نوکروں کی تکلیف کہاں نہیں تھی۔ پھر بھی گھر کی بہو بیٹیاں ہی کام کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ لیکن صولت کے تو نخرے ہی اور تھے۔ کالج کوارٹر میں داخل ہوتے ہی اس کا دم نکل گیا۔ اوپر سے نیچے تک بڑے بڑے ہال نما کمروں کو دیکھتے ہی اسے چُپ سی لگ گئی۔

"اگر بوا نہیں ملی تو صفائی کون کرے گا اُن کی۔ جھاڑو کون لگائے گا؟" وہ کراہ کر بولی "بھئی ہم تو نہیں رہنے کی یہاں۔ میرے لیے اپنی کٹیا ہی ٹھیک ہے۔" لیکن اماں بی تو جیسے مکان پر فریفتہ ہی ہوگئیں۔ کیا ہی کھلی اور صاف ہوادار جگہ ہے یہ۔ اور پھر یہاں تو ایک بڑا سا کمرہ وہ اپنے مصرف کے لیے بھی رکھ سکتی تھیں۔

"تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صفائی کا انتظام ہو جائے گا۔" سجّاد نے بائیں آنکھ کے کونے کو دبا کر دھیرے سے کہا۔

وہ دن اور آج کا دن اماں بی کے لیے یکساں عذاب کا دن تھا۔ کریمن بُوا اور صولت کے تو ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ تھے۔ درجنوں بھر چپراسی اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے اور مہتر فرش ایسے چمکاتا کہ کریمن بُوا اپنا منہ بھی دیکھ لیتیں مگر یہ صفائی ستھرائی اماں بی کے لیے بھاری تھی۔ وہی طہارت کا مسئلہ......

پرسوں عید تھی۔ صولت کو تیاری کی دھوم مچی تھی۔ اس نے عید کے دن سبھی چپراسیوں، مہتر اور ان کے بچوں کی دعوت کر رکھی تھی۔

"سو دن وہ ہمارے لیے محنت کرتے ہیں تو ایک دن وہ ان کے لیے محنت کیوں نہ کرے ؟"

اس کے سوچنے کے ڈھنگ نرالے تھے۔ سجاد جب صولت کے ارادہ سے باخبر ہوئے تو اس نے حیرت انگیز مسرت سے اسے دیکھا اور کالج کے چپراسی جو پہلے نئے صاحب ہی پہ فدا تھے اب صولت پر بھی جان چھڑکنے لگے بس ایک امّاں بی کی چڑچڑ تھی کہ رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی اور اس دعوت اور ضیافت کے قصّے نے تو جیسے آگ کو ہوا دیدی۔

"بہو بیگم کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔" امّاں بی کڑھ کر سوچتیں۔ منجھلی دولہن گھر کی عزّت بگاڑنے پر تُلی بیٹھی ہیں۔ بزرگوں کے بنائے ہوئے اصولوں سے تو جیسے ضد تھی انھیں۔ سب سے پہلا چرکہ تو خانہ داری سنبھالتے ہی لگایا تھا انھوں نے۔ سدا ہی مالکن کی ہانڈیاں الگ پکتی تھیں اور ماماؤں کی الگ۔ لیکن صولت کے ہاتھ میں خانہ داری کی لگام آتے ہی سب برابر ہوا۔ اب کتے کا راتب ہو کہ خران کا کھانا سب ایک ہی تھا۔

سجاد بھی تو صولت کی ہاں میں ہاں ملاتے اور اسے کچھ زیادہ ہی طرح دے جاتے۔ اماں بی کو نوکروں کی یہ نوابیاں بالکل پسند نہیں تھیں۔ باندی باندی ہے اور مالک مالک۔ اللہ نے پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں بنائیں اور نہ ہر ایک کے مراتب ہی یکساں بنائے ہیں۔ سب کی اپنی اپنی اوقات ہوتی ہے۔ اور ان چھوٹی ذات والوں کے تو منہ لگنا ہی فضول ہے۔ اماں بی دل ہی دل ہی میں کڑھتیں۔

صولت ہمیشہ راشن زیادہ تول دیتی اور جب کھانے کے بعد چاول بچ جاتے تو یاد سے اسے فرج میں رکھنا نہ بھولتی۔

"لو بچ بی! تمہاری فضول خرچی تو میرے بیٹے کا گھر بگاڑ دے گی۔ بھلا اتنا

چاول کیوں بناتی ہو کہ اس طرح بچ رہے۔"

"اماں بی! تو کیا ہو گا۔ صبح میں منگوا کو دے دوں گی۔"

"نگوڑے منگوا کا کیا روز کا ٹھیکہ ہے۔ کیا چاول تمہیں مفت آتے ہیں بی بی؟"

"دھن خرچ کرنے سے گھٹتا نہیں اماں بی، بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اور اگر دھن گھٹ بھی جائے تو اعمال نیک ہو جاتے ہیں۔"

صولت بڑی نرمی سے سمجھاتی۔

منگوا فرش پونچھ کر جانے لگتا تو چپاتیاں سیکتے سیکتے دسرتھ اسے آواز دیتا "چاول لیتا جا منگوا۔"

منگوا ہاتھ دھوئے بنا ہی اپنا میلا سا گمچھا دسرتھ کے سامنے پھیلا دیتا اور دسرتھ اوپر ہی اوپر سے چاول سبزی سب کی سب اس کے گمچھے میں ڈال دیتا۔ خوش ذائقہ کھانے اس وقت تک اپنا مزہ کھو چکے ہوتے تھے۔ اب وہ صرف پیٹ بھرنے کا ذریعہ ہوتے جسے منگوا غنیمت جان کر اپنے گمچھے میں سمیٹ کر اپنے بچوں کے لیے باندھ لیتا کہ وہ جنم جنم سے ایسے ہی کھانوں کے لیے پیدا ہوتے تھے۔

صولت کنکھیوں سے منگوا کو جاتے ہوئے دیکھتی۔ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں جن پر وہ دن رات مشقت کی چکیاں پیستا رہتا تھا، اس کے لیے اچھے کھانے مہیا کرنے سے قاصر تھیں۔ اس کے حصے میں وہی باسی اور بدمزہ کھانے ہی آتے۔

باسی کھانوں کے تصور سے صولت کا دل اچانک ہی دکھوں کا انگارہ بن جاتا۔ اس کے ہونٹوں کی ناچتی پھڑکتی مسکراہٹ ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو جاتی۔ چہرے پر نفسیاتی تناؤ اور پیشانی پر سوچ و فکر کی موٹی موٹی لکیریں اُبھر آتیں اُسے گرمی کی تیز تیز سی لہریں اٹھتی محسوس ہوتیں۔ جیسے وہ آگ کی لپیٹ میں ہو۔ کمرے کی تیز سفیدی مائل روشنی سے وہ باہر نکل آتی۔ چاند کی دھیمی ملگجی روشنی میں یا اماوس کی تاریکی میں دور تک ایک قطار سے لگے اونچے اونچے کروٹن کی باڑھ میں وہ آہستہ آہستہ ٹہلتی رہتی۔ ٹہلتی رہتی اور سوچتی رہتی۔ پسینہ کی بوندیں اس کی پیشانی سے پھوٹ بہتیں۔ چاہے وہ

ساون کی کہکشاں بھری رات ہو یا اساڑھ کی سرد چاندنی لیکن اس کا جسم شعلوں میں پھنکتا محسوس ہوتا۔ دُکھ کے بادل گھنے ہوتے جاتے اور ایک ایک کردار...... اس کے اپنے تراشے ہوتے کردار...... آنکھوں میں حسرتناک مایوسی لیے پوچھتے، مجھے کیوں تراشا تم نے۔ مجھے کیوں جنم دیا؟ اب کیا میں تمہارا گلا گھونٹ دوں؟

لیکن کردار اس نے کب تراشے تھے؟ خالق تو بہت بلندی پر تھا۔ عرش اعظم کی بلندیوں سے بھی پرے...... جہاں وہ اپنی تخلیق کو کب کا بھول چکا تھا......

اور...... اور پھر وہ کون تھی؟ ان کرداروں سے اس کا کیا رشتہ؟ مگر یہ کردار تو بچپن ہی سے اس کے جانے پہچانے تھے۔ راستہ چلتے چلتے کتنے کردار اس کے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ جاتے۔ ذہن کے گوشوں سے آہستہ آہستہ دل میں اُتر جاتے۔ اور پھر وہ انھیں کبھی بھول نہیں پاتی۔

اس کا بچپن بھی ایسے ہی گزرا تھا۔ سلائی سیکھتے ہوئے اس کی انگلی میں کبھی سوئی لگ جاتی اور خون کا ایک قطرہ اس کی انگلی پر تھرکنے لگتا تو وہ سارا دن انگلی اور خون دیکھتے ہی گزار دیتی۔ اسے کتنا ڈر معلوم ہوتا تھا خون سے۔ اور اب نظروں کے سامنے کرداروں کا قتل عام تھا اور اس کے دل میں چھالے ہی چھالے۔ انھیں چھالوں کے درمیان اسے منگوا نظر آجاتا...... منگوا...... جسے دیکھتے ہی اس کا دل جلانے ہمدردیوں کے کون سے ساگر سے بھر جاتا۔ رات بیتتی جاتی۔ سجاد آواز دیتے۔

"سو جاؤ صولت بہت رات گزر چکی ہے۔"

"میرا دل دُکھتا ہے سجاد، میں کیسے سو جاؤں؟ دُنیا میں آخر اتنے دُکھی کیوں ہوتے ہیں؟" وہ دھیرے سے کہتی۔

"تم جو سبھی کو خوش رہنا سکھاتی ہو، خود کیوں دل برداشتہ ہو جاتی ہو۔ ایسے ہی اداس ہوتی رہو گی تو دوسروں کو سہارا کیسے دو گی؟"

"جب ہم اپنے بچوں کا مستقبل خود نہیں بنا سکتے تو پھر یہ افزائش نسل کا قصّہ ہی کیوں؟ ہمیں کیا حق ہے تسکین جسمانی کی خاطر ہم اپنے روح و جان سے بھی زیادہ

عزیز بچوں کو اس جہنم کی ایندھن بنا دیں"۔ صولت باغیانہ انداز میں کہتی۔

"کفر نہ بکو صولت اور ذہنی عیاشی چھوڑ دو۔"

"تم بھی میرے دُکھ کو نہیں سمجھتے اور اسے ذہنی عیاشی کہتے ہو"۔ صولت رو ہانسی ہو جاتی۔

"نہیں صولت! صبح ہم دونوں اٹھ کر دُنیا کے سب غم کو پی لیں گے اور پینڈورہ (PANDORA) کے باکس میں بند ہو جائیں گے۔ آؤ صلح کر لیں"۔ سجاد نیند سے بھاری آوازیں کہتے اور دونوں آئیڈیل پرست اس کراہتی دُنیا میں چاند تارے ٹانکنے کی باتیں کرتے کرتے سو جاتے۔ صبح ہوتی تو سجاد غم روزگار کے چکر میں دُنیا کے سارے غم بھول کر صرف اپنے کالج میں چاند تارے ٹانکنے چل دیتے اور صولت اماں بی کو کہانیاں سنانے بیٹھ جاتی۔

عید آگئی۔ صولت کو اپنے چپراسیوں کے دعوت کی پڑی تھی۔ سجاد کو اپنے ملنے ملانے والوں سے فرصت نہ تھی۔ صولت مشینی انداز میں مہمانوں کے لیے سوئیاں، شیر خورمے، کباب اور آلو کے قتلے بھجواتی رہی۔ نمی، ارشد اور رُباب تینوں ہی دادی اماں کے پاس عیدی وصولنے کے چکر میں لگے تھے۔ دو تین گھنٹوں بعد آنے والوں کی یورش میں کچھ کمی آئی تو اس نے گھر اور کالج کے نوکروں کا دستر خوان لگوا کر کھانا چنوا دیا۔ دسرتھ، ارجن، گوپال اور مجید سب خوشی خوشی کھانے بیٹھے۔ ویسے ہی صولت کو یاد آیا۔ منگوا کہاں ہے؟ اس نے دسرتھ کو آواز دی۔

"منگوا کہاں گیا؟ اسے بھی بلا لو۔"

"مائی جی! منگوا ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھائے گا؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ بازار چلا گیا ہے ابھی۔ کہہ گیا تھا کہ میرا کھانا رکھ دینا"۔ گوپال نے بات جلدی سے برابر کر دی۔

صولت معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئی۔ منگوا کو ساتھ بٹھا کر کھلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ خود ہی ٹل گیا تھا۔ صولت کا دل خون ہو گیا۔

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

وہ کراہتے ہوئے گنگنائی۔

کچھ ہی دیر بعد منگوا آ گیا۔

"کھانا کھا لو منگوا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میں اپنا برتن ہی تو نہیں لایا مائی جی۔" منگوا دھیرے سے منمنایا۔

"ارے ہاں! پھر کس میں دوں کھانا۔" صولت بوکھلا گئی۔ پھر اچانک ہی سخت لہجہ میں بولی۔

"دیکھو دسرتھ اور ارجن وغیرہ کھا چکے ہوں گے۔ کوئی بھی تھالی اُٹھا لاؤ...."

ایک لمحہ کے لیے صولت کے دل سے اماں بی کا خوف بالکل ہی جاتا رہا۔ ویسے ہی منگوا آ گیا۔ ہاتھ میں ایک مٹی کی بڑی سی کڑاہی لیے ہوئے، جس میں کبھی کوئی بازار سے مٹھائیاں لایا ہو گا۔ اس میں ننھی رُباب نے مٹی ڈال کر پھول کے پودے لگانے کی کوشش کی تھی اور اب منگوا اسی برتن کو دھو کر صاف کر لایا تھا۔

"اسی میں دے دیجئے مائی جی۔ یہی ٹھیک ہے۔"

"منگوا کے چہرے پر کوئی آثار نہ تھا۔"

"مجید منگوا کا کھانا نکال دو۔" اچانک ہی صولت دیگچی میں چمچہ پٹخ کر باورچی خانہ سے باہر نکل آئی۔ اس کے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے۔

اوپر امّاں بی کی چہ چہاہٹ سنائی دی اور دور کہیں ریڈیو پر گانے کی آواز آ رہی تھی۔

"اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں"۔

دنیا آپ کی

میں اس کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں جو آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے اور میری زندگی بھی اپنے ساتھ لیے جا رہی ہے۔ میں اس کے قدموں کی چاپ کو پہچانتا ہوں، اس کی ہر آہٹ کو جانتا ہوں۔ نجانے کیسے آہستہ آہستہ وہ میری زندگی پر چھاتی چلی گئی اور زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔ جسے بھلا کر شاید میں زندہ نہ رہ سکوں لیکن پھر بھی میں اس کے قدموں کی آہٹ سے گھبرا گیا ہوں۔ اور کمرے سے لگے باتھ روم میں جا کر بلاوجہ ہی ہاتھ دھونے لگا ہوں۔ ہاتھ کیا دھو رہا ہوں ہاتھ مل رہا ہوں کہ اب مجھے اس کے سوا کرنا بھی کیا ہے۔ زندگی نے مجھ سے بڑا سخت سلوک کیا ہے۔

نہ جانے وہ کیسا دن تھا ـــ اچھا یا برا، جو میری ملاقات نفیس سے ہوئی۔ وہ ایک آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ پنڈال کھچا کھچ بھرا تھا اور مشاعرہ اپنے عروج پر تھا کہ نفیس امام کے نام کا اعلان ہوا۔ میں اس نام سے اچھی طرح واقف تھا مگر صورت سے نہیں۔ مشاعرہ کے منچ پر شاید وہ پہلی دفعہ ہی آئی تھی۔ اس نے اپنی ساری کا آنچل پورے جسم پر اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ سرو کے جیسا لچکتا جسم، کندن جیسی رنگت دراز

کھلے بالوں کا سادا سا جوڑا اور میک اپ سے بے نیاز چہرہ۔ یہ تھیں نفیس امام۔ وہ بے حد پرکشش نظر آرہی تھی۔ لوگ اسے دلچسپی سے دیکھ بھی رہے تھے اور سن بھی رہے تھے۔ وہ ایک بامعنی نظم تحت اللفظ پڑھ رہی تھی۔ مجمع نے چیخ چیخ کر ترنم سے غزل پڑھنے کی فرمائش کی۔ لیکن وہ معذرت چاہتے ہوئے مشاعرہ سے رخصت ہوگئی اور نہ جانے کتنوں کا دل لوٹ گئی۔ مردوں کا دل یوں بھی بڑا ڈانوا ڈول سا ہوتا ہے اور اگر حسن کے ساتھ ہنر بھی شامل ہوجائے تو سچویشن بڑا خطرناک ہوجاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد منچ پر میرا دل نہ لگا۔ کسی طرح اپنے آپ کو کھو کر میں وہاں موجود رہا۔ مجھے خلاء میں گم اس کی نیلی آنکھیں یاد آتی رہیں۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ میری زندگی کا ایک اہم موضوع بن گئی۔ اب اکثر وہ مشاعرہ میں شرکت کرتی اور ہمیشہ میرے ساتھ ہی جانا چاہتی، کتنی ہی جگہ جہاں میں نہیں جاتا وہ بھی جانے سے انکار کر دیتی۔ اور کتنی ہی دفعہ میں مشاعرہ میں محض اس لیے شریک ہوجاتا کہ وہاں نفیس شرکت کرنا چاہتی تھی۔ وہ اردو کی ایک منفرد آواز تھی۔ میں اسے دل کھول کر داد دیتا اور کبھی کبھی اصلاح بھی کر دیتا جسے وہ تبرک سمجھ کر اپنے کلام میں جڑ لیتی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بے حد اداس لگتی تھیں۔ اس کی پیشانی پر کتنی ہی لکیریں پیدا ہوکر گہرے نقوش چھوڑ جاتیں۔ وہ فکر میں ڈوبی سگریٹ سے سگریٹ جلا کر پھونکتی جاتی۔ میں کسی حد تک خفگی سے اس سے کہتا۔

"آخر سگریٹ کیوں پیتی ہو اتنا؟ کہیں عورتیں بھی اس طرح سگریٹ پیتی ہیں۔"

"اور کس ملا نے مردوں پر شراب حلال کر دی ہے جو آپ اسے عبادت سمجھ کر پیتے ہیں؟" وہ ڈھٹائی سے جواب دیتی۔

بے تکلف دوستوں کی محفل میں جب پینے پلانے کا شغل جاری رہتا تو وہ بھی بھرے ہوئے جام کی طرف ہاتھ بڑھاتی۔ میں اسے سخت لفظوں میں تنبیہ کرتا۔ اور اس کے ہاتھ سے گلاس چھین لیتا تو اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہوجاتی۔

"میں پوچھتی ہوں آخر ہر چیز پر مردوں کی اجارہ داری کیوں ہے؟" "میں کیوں نہ پیوں اور آپ کیوں نوش فرمائیں۔"

میکش یار ئیس نشہ میں جھومتے ہوئے اسے بھرا ہوا گلاس تھما دیتے اور کہتے:۔
"پیو نفیس، ضرور پیو کہ تم مردوں پر فوقیت لے جاؤ۔ کون کمبخت اپنی اجارہ داری قائم کرتا ہے۔"

وہ بھرے ہوئے گلاس میں سے صرف ایک گھونٹ پی لیتی اور پھر لاکھ کہنے پر بھی دوسرا گھونٹ نہیں لیتی۔ بس اس کی آنکھیں کہیں خلا میں گم ہو جاتیں۔ وہ چپ چاپ اٹھتی اور اپنے فلیٹ کی طرف چل دیتی۔

نفیس کے اس بے باک رویے نے اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس کے متعلق ایک بحث کا موضوع یہ تھا کہ وہ بیک وقت بہت سے مردوں کو اپنی تفریح کا موضوع بنا لیتی ہے اور انہیں اس طرح ہضم کر جاتی ہے جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اکثر لوگ اس سے صرف تفریحاً ملا کرتے تھے۔ لیکن وہ میرے وجود پر چھاتی چلی گئی۔

ان دنوں اس کی اداس آنکھیں کچھ زیادہ ہی گمبھیر نظر آتی تھیں۔ اس کا باغیانہ انداز قدرے مدھم پڑ گیا تھا۔ وہ بے تکلف دوستوں کی شاعرانہ محفل میں بھی جانے سے گریز کرتی اور زیادہ سے زیادہ وقت اپنے فلیٹ میں ہی گزارتی تھی۔ میں جب بھی اس کے یہاں پہنچ جاتا تو وہ اپنے بچوں کو پڑھاتی نظر آتی۔ مجھے دیکھ کر اچانک ہی بہت خوش ہو جاتی اور اپنا تازہ کلام سنانے لگتی۔ میں اپنے خیالات میں گم ہو جاتا۔

نفیس — نفیس امام! تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ مجھے تم سے بے حد ہمدردی ہے۔ لیکن تمہاری تنہائی کا مداوا کیا ہے؟

میں جانتا ہوں کہ تم پریشان رہتی ہو۔ تمہیں اپنے بچوں کی پرورش کرنی ہے۔ زیبا اور مونس تمہارے دو چراغ تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں روشن ہیں۔ مگر کیا تم یہ نہیں جانتی کہ ہندوستان میں قلم کی کمائی پر زندہ رہنا مشکل ہے۔ پھر بھی تم اخبار کا

کا اڈیٹوریل لکھ کر زندہ ہو ۔ مجھے تمہاری تنہائی سے ہمدردی ہے ۔ لیکن تمہیں کیا میری تنہائیوں کا خیال نہیں آتا ؟

میں نے نفیس کو آج اپنے گھر بلایا تھا تاکہ اسے اپنی تنہائی کا احساس دلا سکوں اور یہ بھی بتا سکوں کہ تم ۔ نفیس تم میرے وجود پر چھا چکی ہو ۔ اس لیے اب میں خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا ۔ پھر کیوں نہ ہم دونوں زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرلیں ۔ بہت سے واقعات زندگی میں رونما ہوتے ہیں ۔ ایک یہ بھی سہی ۔

نہ جانے میں نے کن لفظوں میں تم سے کہا اور نہ جانے کن لفظوں میں تم نے سنا ۔ یہ سب کچھ ٹھیک سے یاد نہیں ۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ تمہاری آنکھیں بری طرح برس رہی تھیں اور تمہاری ہچکیاں بندھ گئی تھیں ۔ ان ہچکیوں کے درمیان تمہاری ڈوبتی ابھرتی آواز میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح اترتی جارہی تھی ۔ اور میرے شریانوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی اور مجھے جھلستی جارہی تھی ۔ تم کہہ رہی تھیں ۔

" مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے خدایا ! نہ میں نے تیری عبادت سے انکار کیا نہ تیرے وجود سے ۔ صرف ایک سوال تھا میرا وہ بھی میری اماں سے ۔ ایک چھوٹا سا سوال کہ اماں بی انو کو ہمیشہ اچھی چیزیں کیوں دیتی ہیں ، مجھے کیوں نہیں ؟ انو تو ہمیشہ سے دو سال چھوٹا ہی تھا ۔ ایک چھوٹا سا سوال ہی آخر بہت بڑا ہوگیا ۔ انو کی افضلیت ہر چیز پر قائم رہی اور میری کمتری مجھے ہمیشہ رلاتی رہی ۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے چاروں طرف الفاظ کا گھروندا بنانا شروع کیا ۔ مجھے پناہ ملی تو اپنی شاعری میں ۔ میں سب کچھ بھول کر اپنے گیتوں میں مگن رہی ۔ یہاں تک کہ میری شادی رفیق سے ہوگئی ۔ رفیق گورنمنٹ کے عملہ کے ایک ذمہ دار افسر تھے ۔ لیکن اچھے خاصے ذمہ دار افیسر نے میرے ساتھ نہایت غیر ذمہ داری کا سلوک کیا ۔

ملک کے ایک ادبی جریدے نے بڑے اہتمام سے میری بہت سی نظمیں اور میری

تصویر شائع کی تھی۔ یہ میری شناخت کا ایک کھلا اعتراف تھا۔ میں نے لپک کر رسالہ رفیق کو دکھایا، لیکن وہ اسے دیکھتے ہی بھڑک اٹھے۔ چیخ چیخ کر مجھ سے کہا کہ ایسی بیہودہ شاعری اور اپنی تصویر چھپوا کر تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ میں نے گھبرا کر صفائی پیش کی کہ میں نے کوئی بے عزتی نہیں کی ہے صرف چند نظمیں ہی تو لکھی ہیں۔ لیکن رفیق پھر گئے تھے۔ میں چھپ چھپ کر روتی رہی اور نظمیں لکھ لکھ کر پھاڑتی رہی۔ ہفتہ دس دنوں کے اندر خطوط کے انبار لگ گئے۔ کسی نے میری شاعری کو سراہا اور کسی نے میری تصویر کو۔ رفیق غصہ سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ آخر انھوں نے اپنی والدہ سے مشورہ کر کے مجھے طلاق دے دیا۔

میں روتی رہی اور کہتی رہی کہ اب میں شاعری نہیں کروں گی۔ خدا کے لیے مجھے طلاق نہ دو۔ لیکن رفیق اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔

میں مجبور محض اپنی رسوائیوں کا لبادہ اوڑھے ایک طلاق شدہ عورت کی حیثیت سے واپس آ گئی۔ پھر میں نے اپنا مقابلہ اتو ہے کبھی نہیں کیا۔ ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا اس لیے ماں مجھے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوتی رہی اور موقع پاتے ہی مجھے پھر بیاہ دیا۔ ایک رئیس و کبیر بزنس مین سے۔ وہ آج کے دور کا ایک مصروف ترین انسان تھا۔ صبح سے شام تک وہ ہر طرح کے بزنس افیئر میں مصروف رہتا اور رات آتی تو شراب سے اور مجھ سے ایک جیسا سلوک کرتا۔

میں اس کے لیے کوئی زندہ شے نہیں محض نشہ اور وابستگی کا سامان تھی۔ ہر رات میری گزشتہ رات سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی گئی۔ میرے جسم کا ایک ایک حصہ اس کے وحشیانہ پن کی فریاد کرتا۔ شام کی آمد کے ساتھ ہی میں وحشت زدہ ہونے لگتی۔ یہاں تک کہ ایک رات میں اس درندہ سے چھٹکارہ پانے کے لیے گھر سے بھاگ نکلی۔ اور دوسرے دن کورٹ میں حاضر ہو کر میں نے خلع کا مطالبہ کیا۔ میرے جسم پہ میری گواہی کے انگنت ثبوت موجود تھے اس لیے میں آزاد ہو گئی۔ میری ماں میری حرکتوں پر شرمندہ تھیں اس لیے میں گھر نہیں گئی شہر بھی چھوڑ دیا اور یہاں

آگئی۔ یہاں سے جو بھی کچھ جیسی بھی تھی وہ آپ جانتے ہی ہیں۔

نفیس کی سسکیاں تیز ہو گئی تھیں۔ نفیس کے لیے میری تمام ہمدردیوں نے محبت کا روپ دھار لیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے اپنے بازوں میں جکڑ لوں اور کسی طرح تھپک تھپک کر چپ کرادوں۔ آخر میں اسے اس طرح بلک بلک کر روتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ ہچکیوں کے درمیان وہ پھر کہنے لگی۔

"یہاں آکر میں نے سب سے بزرگ، سب سے عظیم شاعر سے اپنا ناتہ جوڑ لیا۔ یہ آپ تھے بابا، آپ تھے۔ آپ کی روپ ریکھا میں، میں اپنے والد کا عکس پاتی تھی۔ جن کی شفقت سے میں بچپن میں ہی محروم ہو گئی۔ آپ نے بھی میرے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ چند دنوں میں بھابھی میکہ سے گھر آجائیں گی۔ شاہدہ بھی چھٹیوں میں گھر آنے والی ہیں۔ پھر آپ کا گھر نانی پوتوں سے بھر جائے گا۔ آپ مجھے بھی ایک بیٹی سمجھ کر بہٹ لیتے بابا۔"

میں نے بوکھلا کر کمرے سے لگے باتھ روم میں آ گیا ہوں۔ اور ہاتھ دھو رہا ہوں لیکن ہاتھ کیا دھو رہا ہوں ہاتھ مل رہا ہوں۔ مجھے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ جو آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی ہے۔ سسکیوں میں اس کی ڈوبتی ابھرتی آواز آ رہی ہے۔

"یہ دنیا آپ کی ہے بابا۔ آپ کی، انو کی، یا رفیق کی۔ آپ کو اختیار ہے کہ آپ جو چاہیں سو کریں۔ آپ ہمیں جیسے چاہیں برت لیں۔ میں نے غلط سوچا تھا کہ اماں بی انو کو فضیلت کیوں دیتی ہیں۔

(پٹنہ سے نشر)

سب خیریت ہے

بیگم ظہیر نے جیسے ہی سلام پھیرا فون کی گھنٹی ٹنٹنانے لگی۔ کبھی کبھی فون بھی گرم ہو جاتا ہے۔ نیچے سے ہی فون نے قسم کھائی تھی کہ وہ بجتا ہی رہے گا۔ اور ظہیر صاحب تھے نہیں۔ فون ، بیگم ظہیر ہی کو سننا پڑتا۔ وہ ہر فون کا نہایت کاروباری انداز میں جواب دیتیں۔ اس دفعہ بھی انھوں نے عجلت میں دُعا مانگی اور فون کرنے والے کو دُعا دیتی اٹھیں۔

" ہیلو" انھوں نے نہایت بددلی سے کہا۔

" چاچی پرنام۔ میں پرکاش بول رہا ہوں" ادھر سے بڑی پُرخلوص آواز آئی۔

" خوش رہو" بیگم ظہیر نے چونک کر کہا۔ ایک تیکھی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

" خیریت ، کیسے یاد کیا ؟ "

" چاچی ، آج دسویں کی پوجا ختم کی ہے۔ آپ کے لیے اور چاچا کے لیے بھی پرارتھنا کی تھی۔ پوجا بہت اچھی ہوئی"

" خدا تمہیں ہر سال ایسی پوجا نصیب کرے" بیگم ظہیر نے گمبھیرتا سے کہا۔

"واہ چاچی! بہت اچھی بات کہی آپ نے۔ بس آپ کی ایسی ہی باتوں پر تو مرا مٹا رہتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں، اور تو سب خیریت ہے؟" بیگم ظہیر نے بالکل کاروباری انداز اختیار کر لیا۔

"جی ہاں۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ جی ہاں سب ٹھیک ہے؟" پرکاش ہکلانے لگا۔

"اچھا فون رکھتی ہوں، دھوبی انتظار کر رہا ہے۔"

پرکاش نے کھٹ سے فون رکھنے کی آواز سنی۔ اسے اتنی جلد بات ختم ہونے کی امید نہیں تھی۔ ریسیور کو اس نے دائیں بائیں گھما کر دیکھا۔ وہاں صرف شوں شوں کی آواز تھی۔ وہ آہستہ سے مسکرایا۔ تو یہ رنگ ہے چاچی کا۔ ٹھیک ہی ہے۔

سامنے صحن میں لانگ چیئر پر لیٹے ہوتے ہیم ساگر جی، پرکاش کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ابھی دس دنوں کی طویل پوجا کے بعد وہ اٹھا تھا۔ بھوکا پیاسا۔ تمام دُنیا کے گورکھ دھندوں سے الگ اپنے من کی انتر یاترا میں مگن۔ مگر اٹھتے ہی گھنٹہ بھر سے فون کئے جا رہا تھا۔ جیسے دنیا والوں سے اپنا چھوٹا ہوا رشتہ جلد از جلد استوار کر لینا چاہتا ہو۔

"کس کو فون کر رہے تھے پرکاش؟" ہیم ساگر جی پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔

"جی چاچا، وہ ذرا ظہیر چاچا کے یہاں بات کر رہا تھا۔"

ہیم ساگر جی نے بُرا سا منہ بنایا، اور سوچا، بلاوجہ ہی ہر جگہ گھستا چلتا ہے۔

"کوئی خاص بات تھی کیا؟"

"جی نہیں بس یوں ہی۔"

پرکاش نے سوچا، چلو اپنا کیا ہے۔ میرا جو فرض تھا وہ میں نے پورا کیا۔ اب دو چار مہینوں کی آمد ہوگی۔ سمے گزرنے پر پھر مل لوں گا۔ وقت تمام حالات خود ٹھیک کر دیتا ہے یا وقت کی گرد تلے ہر چیز دھندلا جاتی ہے۔

پرکاش اور چاچی کی دوستی دو چار سالوں سے دونوں گھرانوں میں بہت مشہور

تھی۔ جب سے ظہیر صاحب اپنے عہدہ کے چیف ہوئے پرکاش کئی دفعہ اپنے ٹرانسفر کے سلسلے میں ان سے مل چکا تھا۔ پرکاش کے والدین ضعیف بھی تھے اور تنہا بھی۔ اس لیے ہر حال میں وہ اپنا ٹرانسفر چاہتا تھا۔ لیکن ظہیر صاحب مصروف آدمی تھے اور پرکاش خاموش طبع۔ کچھ کہنے سننے کی اُسے عادت نہ تھی۔ مسز ہیم ساگر اپنے بیٹے کے مزاج سے واقف تھیں۔ اس لیے وہ اپنی بہو کے ساتھ اسے سیدھے بیگم ظہیر کے پاس بھیج دیتیں۔ ظہیر صاحب اور ہیم ساگر جی دونوں ہی شہر کے مشہور جانے مانے شہری تھے۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ بہر حال بیگم ظہیر کی وساطت سے پرکاش کا ٹرانسفر اس شہر میں ہو گیا اور ظہیر صاحب کے ساتھ ہی اس نے کام سنبھالا۔ پرکاش دن بدن چاچی کے گرویدہ ہوتے گئے۔ اور چاچی جب تک ہر اچھا پکوان پرکاش کو کھلا نہ دیتیں دم نہ لیتیں۔ دُرگا پوجا میں جب پرکاش کا دس دنوں کا اُپواس چلتا تو مسز ہیم ساگر کے ساتھ بیگم ظہیر بھی اس کا خیال رکھتیں۔ بار بار فون کر کے اس کی خیریت پوچھتیں، نئی دھوتی بھجواتیں جسے پہن کر پرکاش پوجا استھان گرہن کرتے۔ اور دس دنوں بعد جب پوجا ختم کرتے تو ماں کا پاؤں چھو کر بیگم ظہیر کو فون سے پرنام کرتے۔ پھر گھر پہنچ کر ماں سمان چاچی کا پاؤں چھوتے اور آشیرواد لیتے لیکن ہوا یہ کہ دو سال بعد ہی ظہیر صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا اور کئی چھوٹا موٹا پرسنل پراجیکٹ جو دونوں نے مل کر شروع کیا تھا ادھورا رہ گیا۔

بیگم ظہیر بچوں کی تعلیم اور ادھورے پراجیکٹ کو پرکاش کی مدد سے پورا کروانے کی خاطر ظہیر صاحب کے ساتھ نہیں گئیں۔ لیکن پرکاش..... آئے... گئے۔ اور پھر حاضر غائب صیغہ میں داخل ہو گئے۔

بیگم ظہیر گھبرا کر پرکاش کو فون کرتیں۔ تو جواب ملتا۔

"دیکھیئے نا چاچی میں گیا تو تھا پراجیکٹ کا کام دیکھنے سب ٹھیک ہی چل رہا ہے۔"

"ٹھیک کیا خاک چل رہا ہے۔ روز شام کو ہیمنت سنگھ اور اتوار دس طرح کے پیپر مجھے بھجوا دیتے ہیں۔"

"گھبرایئے نہیں چاچی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
بیگم ظہیر فون کرتیں۔ "پرکاش ہیں؟"
"جی نہیں ابھی چلے گئے۔"
"پرکاش آئے؟"
"جی! وہ اب تک نہیں آئے۔"
"خیر آ جائیں تو ان سے کہنا مجھے فون کر لیں"۔ بیگم ظہیر مکمل اعتماد کے ساتھ کہتیں لیکن فون کبھی نہیں آتا۔
"پرکاش! میں تمہاری ماں سمان چاچی بول رہی ہوں"۔ جھنجلاہٹ میں بیگم ظہیر فون پر ہی چیخنے لگتیں۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم....."
"وہ تو آپ ہیں ہی لیکن اتنا غصّہ کیوں کر رہی ہیں چاچی۔"
بیگم ظہیر نماز پڑھتیں تو دھیان بٹ جاتا اور سوچنے لگتیں، آخر پرکاش اس طرح کیوں کتراتے ہیں؟ پرکاش ایسا کیوں کر رہے ہیں؟
بیگم ظہیر پر صدمے گزرتے رہے اور ادھورے پراجیکٹ انھوں نے خود ہی ہمت کر کے مکمل کروا لیے۔ پرکاش کے پاس اب وقت بالکل نہیں تھا۔ وہ بے حد مصروف ہو گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ اور وقت کی گرد تلے سب رشتے ناطے دھندلاتے رہے۔ کبھی کبھی دونوں کی ملاقات ہو جاتی تو بیگم ظہیر مسکرا کر جواب دیتیں۔ "سب ٹھیک ہے۔ سب خیریت ہے۔ تم تو اچھے ہو۔"
مہینے سالوں میں بدل گئے۔ ایک دن پرکاش نے اپنے آفس کے قریب دو ڈھائی بجے دن میں اوما کانت جھا، ان کے بچوں اور بیگم ظہیر کے بچوں کو ایک ساتھ گھومتے پھرتے قریب کے پارک میں دیکھا۔
"ضرور دال میں کچھ کالا ہے"۔ پرکاش نے سوچا اور وہ اوما کانت جھا اور بچوں کو اپنے آفس میں پکڑ لائے۔ تب انھیں پتہ چلا کہ اوما کانت جھا بیوی بچوں کے ساتھ بیگم ظہیر کے یہاں چھٹی گزارنے آئے ہیں۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ اوما کانت اور ان کی مسز بیگم

ظہیر کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پرکاش اچانک ہی خلائیں گم ہو گیا۔کتنے دنوں سے چاچی سے دل کھول کر بات بھی تو نہیں ہوئی۔کبھی اتفاق سے ملاقات ہو بھی جاتی تو سب ٹھیک ہے سب خیریت ہے کہہ کر وہ بات ہی اڑا جاتیں پہلے کتنی باتیں کیا کرتی تھیں۔اب جیسے باتیں کرنا ہی بھول گئی ہوں۔

پرکاش اپنے آفس میں بیٹھے بلا وجہ ہی اوما کانت اور اُرملا پر جل بھن کر خاک ہوتے رہے اُرملا کی عادت بھی تو ویسی ہی تھی۔جب بھی پرکاش کو وہ اِدھر اُدھر مل جاتی تو پوچھتے۔

"چاچی سے ملاقات ہوئی تھی آپ کی ان دنوں ؟"

"ہاں ہاں،کیوں نہیں۔کل ہی تو آنٹی کے پاس گئی تھی۔" وہ ہنستے ہوئے کہتیں اور پرکاش چل دیتے۔ارملا کو خوب معلوم تھا اور سارا شہر ہی جانتا تھا کہ ان دنوں پرکاش بڑے بڑے کاموں میں مصروف تھے۔اور مُلک کے خاص لیڈروں کے ساتھ ہی ان کا وقت گزرتا تھا۔پرکاش کا آفس بیگم ظہیر کے مکان سے بالکل قریب تھا۔اس دن پرکاش اپنے آفس میں بیٹھے دور سے نظر آتے ہوتے مکان کو تکتے رہے۔پھر غیر متوقع طور پر ان کی انگلیاں ظہیر صاحب کے فون نمبر پر دوڑنے لگیں۔

"ہیلو! ایٹ از تھری سیکس نائین ایٹ"۔

"چاچی پرنام" جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔

"خوش رہو کیا بات ہے ؟"

"مجھے بریانی کی مہک لگ رہی ہے چاچی"۔

"ضرور لگ رہی ہو گی"۔

"میں آرہا ہوں چاچی"۔

بیگم ظہیر چپ رہیں۔

"دیکھئے، یہ میں نے فون رکھا،ایک جمپ لے کر نیچے پہنچا اور پھر آپ کے دروازے پر"۔ بیگم ظہیر پھر بھی چپ رہیں۔فون ڈسکنکٹ ہو گیا۔دس منٹ بعد ہی پرکاش کے اسکوٹر

کے رُکنے کی آواز سنائی دی اور وہ آستین چڑھاتے ہوئے داخل ہوئے۔

"بہت بھوک لگی ہے چاچی۔"

"لیکن کھانا تو ہم لوگ کھا چکے۔"

"پھر بھی میرا حصّہ کچھ بچ ہی رہا ہوگا۔" پرکاش نے ڈھٹائی سے کہا۔

بیگم ظہیر اداسی سے مسکرائیں۔ "وہ تو ہمیشہ ہی بچ رہتا ہے، خاص کر جب کوئی اچھی چیز پکتی ہے تو تمہارا حصّہ الگ ہی رکھ دیتی ہوں کہ شاید کبھی بھولے بھٹکے آہی جاؤ۔ ارمیلا ذرا پرکاش کا کھانا گرم کروالو۔"

اسی وقت سونا نے آکر کہا۔ "ممّا! کھانا لگادیا گیا ہے پرکاش بھیا کا۔"

آپ کے لیئے
سمیع آہوجا